رقصِ جنوں

بشریٰ سعید

پیش لفظ!

''رقص جنوں'' کو قلم بند کیے آج قریب آٹھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور آج تک آپ نے اسے فراموش نہیں کیا۔ آپ کی پذیرائی ہے جو اس کہانی کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا باعث بنی۔ اچھی خبر یہ ہے کہ اس کتاب میں کہانی کے ان حصوں کو بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے جو قبل ازیں ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپ تک نہ پہنچائے جا سکے۔

اس کہانی کی بنت کے حوالے سے چند باتیں آپ کو بتانا چاہتی ہوں جو آپ کو یقیناً دلچسپ لگیں گی۔ غالباً 2000ء یا 2001ء کا قصہ ہے کہ میں اپنے بھائی عمر کے ساتھ اوکاڑہ شہر میں خریداری کی غرض سے گئی۔ ایک دکان سے باہر آتے ہوئے میری نظر ایک بھکاری عورت پر پڑی جو ایک خستی چبوترے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ایسے بہت سے بھکاری آپ نے دیکھے ہوں گے اور کبھی کبھار ان میں سے کوئی اپنی غیر معمولی ہیئت کی بنا پر توجہ بھی کھینچ لیتا ہے۔ اس بھکارن میں بھی ایسی ہی خصوصیت تھی۔ وہ کسی جلدی بیماری میں مبتلا تھی جس نے اس کے چہرے کو کریہہ المنظر بنا دیا تھا۔

جیٹھ ہاڑ کا موسم تھا اور ہوا میں سخت حدت تھی مگر وہ لُو کے تھپیڑوں سے بے خبر تپتے فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ ڈھلتی عمر کی ایک نحیف عورت تھی۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کے نزدیک جاتے ہوئے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ بہرکیف جی کڑا کر کے میں چند قدم آگے بڑھی اور دور سے ہی کچھ روپے اس کے سامنے چبوترے پر پھینک دیئے۔ وہ ذرا سا چونکی اور کچھ بولی۔ اس کے ہونٹوں پر اور شاید دہن میں بھی زخم تھے جن کی وجہ سے اس کی آواز واضح نہیں تھی، پھر بھی وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا تھا۔

''حقار کرنی ایں، تیرا ویلا دور نئیں۔ (حقارت کرتی ہو، تمہارا وقت دور نہیں)

میں تیزی کے ساتھ اس جگہ سے گزر گئی اور دیر تک میری دھڑکن بے ترتیب رہی۔ فوراً

ہی خیال آیا کہ اس مجنون عورت پر کوئی افسانہ لکھنا چاہیے لیکن بہت عرصہ تک کوئی ایسی کہانی تخلیق نہ ہو پائی۔

اس بات کو ڈیڑھ دو سال بیت چکے تھے کہ ایک دن اخبار میں شائع ہونے والا ایک واقعہ میری نظر سے گزرا۔ اس خبر کو پڑھتے ہوئے ''جاثیہ'' کا خاکہ میرے دماغ میں تشکیل پانے لگا۔ کہانی کا تانا بانا بُنتے ہوئے وہ بوڑھی فقیرنی مجھے یاد آ گئی اور اس طرح ''رقص جنوں'' کا جنم ہوا۔ اس تحریر کے بارے میں اپنی رائے دینے کی کوشش میرے نزدیک غیر ضروری ہے۔ یہ کام 'آپ' یعنی میرے قارئین بخوبی کر سکتے ہیں۔

ہر لکھاری کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے اور وہ اللہ کا ودیعت کردہ ہوتا ہے۔ جہد سے نکھار لایا جا سکتا ہے مگر فطری میلان کے دائرے کی حد پار کرنا مشکل ہے۔ بیہ، نباتاتی ریشوں کو سی کر ایک پیچیدہ گھونسلا کا ڑھتا ہے اور کوا چند تنکوں اور لکڑی کی ٹکڑیوں کو اوپر تلے لاد کر بدوضع سا مسکن بناتا ہے۔ بیہ کا گھروندا کوے جیسا اور کوے کا آشیانہ بیہ جیسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ کہنے کا مقصد محض اتنا ہے کہ تحریر آئینہ ہوتی ہے جس میں تخلیق کار کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

آخر میں محترم محمد علی قریشی اور القریش پبلی کیشنز کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی کدو کاوش سے میری تحریریں آپ تک پہنچیں۔

بشریٰ سعید

آٹھ دسمبر سن دو ہزار گیارہ

پجارن دیوتا کو منانے کے لیے رقص کر رہی تھی۔ دیوتا کے درشن کی آشا اس کے بند بند میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے متحرک قدموں، گردش کرتے لہراتے بازوؤں میں، گردن کے تناؤ اور کمر کی لچک میں، ابروؤں کی جنبش، آنکھوں کی پتلیوں کی لرزش میں، پلکوں کی تھرتھراہٹ میں، سانسوں کے تموج میں، دھڑکن کی تال میں وحشت بھری التجا تھی۔ اس کے روم روم میں اضطراب کسی دہکتے ہوئے آتشیں سیال کی طرح سرچُنخ رہا تھا۔

اس کا تھرکتا ہوا بدن طلب کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس کے ناچتے قدموں کی دھمک سے مندر کا سنگلاخ سینہ دھڑکتا تھا۔ گھنگھروؤں کا شور سیلن زدہ، تاریک فضا میں پھنکارتا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے رقصاں پیروں کی جنبش فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ پتھریلے چبوترے کے سامنے ناچتے ہوئے وہ ہر شے سے بے نیاز تھی۔ ننگے پیروں کے سنگین فرش سے ٹکرانے پر تلووں سے پنڈلیوں کی جانب اٹھتی درد کی ٹیسیں بھی اس کے رقص کو مدھم نہیں کر پا رہی تھیں۔ ہر بار یخ بستہ فرش سے پاؤں چھونے پر پہلے سے بڑھ کر تکلیف دہ احساس ہوتا لیکن نہ تو اس کی انگلیاں سکڑتیں اور نہ ہی چہرے کے عضلات کھنچتے۔ اس کے رقص میں کسی منہ زور پہاڑی چشمے جیسی دیوانگی تھی۔

صنم کدے کی دیواریں یک لخت دور ہٹتی محسوس ہوتیں تو اگلے پل ایک دوجے میں مدغم ہونے لگتیں۔ گھومتا اور ڈولتا ہوا معبد سیاہی مائل سرخی میں ملفوف نظر آتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کی رگیں پھٹ گئی ہوں، جیسے ان سے لہو رسنے لگا ہو۔

وہ ناچتی رہی.....

اس کی سانسیں تن کا ساتھ چھوڑنے لگیں۔ اعصاب گیلی ریت کی طرح بوجھل ہو گئے۔

وہ رقص کرتی رہی.....

اس کے تلووں میں برچھیاں کھب رہی تھیں۔ ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے گھنگھرو اس کے پیروں تلے آتے تو جلد ادھڑ جاتی، انگلیاں، پیروں سے جدا ہوئی جاتی تھیں، اس کے پیروں سے خون رسنے لگا۔ مندر کے فرش پر شنگرفی دھبے پھیلنے لگے۔ وہ ناچتی رہی.....

پیروں سے بہتا ہوا لہو، جسم کی چٹختی ہوئی ہڈیاں اور ٹوٹتی رگیں اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ نڈھال ہو کر گرنے پر مائل کر رہی تھیں۔

مگر وہ ناچتی رہی.....

وہ ٹھان چکی تھی کہ دیوتا کو منانے کی خاطر جیون دان کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے گی۔ رقص میں ایک ایسا لمحہ آیا جب مندر کی ہر شے نے 'وجود' کا لبادہ اتار کر 'عدم' کی چادر اوڑھ لی۔ صرف داسی رہ گئی اور دیوتا۔ ایک پوتر اندھیرے میں لپٹی وہ رقص کر رہی تھی۔ ذات کے صحرا سے سب نخلستان، سارے قافلے مٹ چکے تھے۔ ایک مقدس سناٹا چاروں اور پھیلا تھا۔ دیوتا کے سوا وہ ہر شے سے رشتہ توڑ چکی تھی، ہر درد، ہر تکلیف سے ماورا ہو چکی تھی۔

یہ اس کے رقص کا نقطۂ عروج تھا۔ پھر ایک مقام پر وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کس لیے ناچ رہی ہے، اس مجنونانہ رقص کا محرک کیا ہے۔ لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی۔ اب اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ کسی ایک عضو کو بھی اپنی مرضی کے تابع نہیں پاتی تھی۔ پھر ایک ہولناک گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی طلسم ٹوٹ گیا، اس کے وجود سے لپٹی نادیدہ زنجیروں کے آہنی بل کھل گئے۔

اس کے ناچتے پاؤں تھم گئے۔ بت کدہ ڈول رہا تھا، پتھریلی دیواروں میں دراڑیں بن رہی تھیں، چھت جھکی چلی آ رہی تھی۔

خون ٹپکاتی آنکھوں سے اس نے بمشکل دیکھا کہ شانت آسن میں بیٹھے دیوتا نے پہلو بدلا تھا، دیوتا درشن دینے آ چکے تھے۔ اس کی تپسیا کے کارن بندھن کھل گئے تھے۔ دیوتا کی بند آنکھوں کے سنگی پپوٹے تھرتھرائے اور آنکھیں چرکر کانوں تک کھل گئیں۔ تب پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا۔ مندر کی مقدس فضا میں عجب طرح کی کثافت گھل گئی تھی۔ پاکیزہ سکوت تار تار ہو چکا تھا۔ اور ہر گوشے سے وحشت کے سنپولیے رینگتے ہوئے اس کے قدموں میں سرسرانے لگے

تھے۔ تب پجارن کو ادراک ہوا کہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اصل میں اس کی خواہش یہ نہیں تھی۔ اس کی خوشی محض اسی میں پوشیدہ تھی کہ وہ دیوتا کو منانے کی خاطر رقص کرتی رہے، دیوانہ وار ناچتی رہے اور دیوتا نہ مانیں۔ وہ بنتی کرتی رہے، تڑپتی رہے، سسک سسک کر فنا ہو جائے اور آس پوری نہ ہو۔ دیوتا مان گئے تھے، درشن دینے آ چکے تھے تو اس کے دل میں سہم بیٹھ گیا تھا۔

دیوتا سنگلاخ چبوترے سے قدم اتار رہے تھے۔ چرنوں میں رکھے ہوئے پوجا کی آرتی کے پھول خون آلود فرش پر بکھر گئے تھے۔ اس نے بھاگنے کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ مندر کا دروازہ منہدم ہو چکا تھا۔ باہر نکلنے کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ لحہ بہ لحہ دیوتا اس سے قریب تر ہو رہے تھے۔ اس نے دور ہٹنا چاہا اور لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گئی۔ تب اسے یاد آیا تھا کہ اس کے پاؤں لہولہان تھے۔ اس میں ایک قدم اٹھانے کی سکت نہ تھی۔

داسی یہ بات فراموش کر بیٹھی تھی کہ دیوتا جب تلک سنگھاسن پر براجمان رہیں، ساکت اور جامد ہوں، فریادوں، التجاؤں سے بے نیاز رہیں، دیوتا ہوتے ہیں اور جب سانس لینے لگیں، جمود ٹوٹ جائے تو دیوتا نہیں رہتے، انسان ہو جاتے ہیں اور انسانوں سے خوف تو آیا ہی کرتا ہے۔

✠ ✠ ✠

جیٹھ کی گلابی شام سلونی قبا اوڑھے، ڈیوڑھی کی نیم پختہ دیوار سے لپٹی سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی اور اس کا گلابی رنگ پگھل پگھل کر ہمس زدہ رات کے تاریک سیال میں گھلتا جاتا تھا۔ اس مٹتی ہوئی شام کی نیم جان آنکھوں میں غضب کی اداسی تھی۔

مغرب کی اذانوں کو تمام ہوئے کچھ وقت بیت چکا تھا مگر شہ نشینوں اور اونچے پیڑوں کی آخری پھننگوں پر اب تک موذنوں کی خوش الحانی کا لمس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بہت دیر سے بے حس و حرکت لیٹی املی کے پتوں کی سبز رنگت کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساکت آنکھیں گھنیری شاخوں میں الجھتے اندھیرے کے اسرار بھرے بہاؤ پر جمی تھیں۔ مغرب کی اذان اس کی سماعت پر بہت دھیمی سی دستک دے کر لوٹ گئی تھی۔ اتنا ارتعاش بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل سکتا۔

اماں اس کی پائنتی بیٹھی باسی روٹی کے کچلوندے بنا بنا کر مرغیوں کی جانب اچھال رہی

تھیں۔ کنیز ہینڈ پمپ کا اکھڑے ہوئے روغن والا کھڑ کھڑاتا ہوا ہینڈل دونوں ہاتھوں میں تھامے، اسے ایک جھٹکے سے فضا میں اچھالنے کے بعد جسم کے پورے زور سے نیچے کی جانب دبا دیتی۔ پیتل کی جھجری کے پیندے سے ٹکراتی پانی کی دھار کی گھرر۔۔۔گھرر۔۔۔، نلکے کے ہتھے کی کھوں کھڑکھوں اور کچلوندوں پر جھپٹتی مرغیوں کی کٹ کٹ کی آوازیں اس کے چاروں اور ہلکورے لیتی کچھ باور کرانے کی کوشش میں سر پٹخ رہی تھیں مگر کوئی ایسا خول اس کے گرد تنا تھا جو کسی بھی آواز کو اس کی اصل شدت کے ساتھ اس تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔

''نی عیشو! اٹھ نماز پڑھ لے۔''

اماں کی آواز سے غیر مرئی خول میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ساری آوازیں بے قرار ہو کر اس کی سماعت کی طرف بھاگیں۔

''عیشو! اٹھ نماز پڑھ لے.....''

بوڑھے نلکے کے چیختے ہوئے سینے سے ہانپتی، کھانستی آواز نے التجا کی۔

''نماز پڑھ لے.....اٹھ جانی.....''

مرغیوں نے روٹی کے ٹکڑوں سے منہ پھیر لیا اور ایک آہنگ ہو کر اسے پکارنے لگیں۔

''اٹھ جا.....اٹھ نماز پڑھ لے.....''

پانی کی دھار کان کی لو سے چمٹ کر ناگ کی طرح پھنکارنے لگی۔

''نماز پڑھ لے.....اٹھ نماز پڑھ لے.....نماز پڑھ لے.....نماز.....''

املی کی شاخیں سرسراتی ہوئی آواز میں چلانے لگیں۔ رین بسیرا کرنے والی چڑیاں شور مچانے لگیں۔

اس نے کروٹ بدل کر ایک نظر اماں کو دیکھا مگر اٹھ کر نہ بیٹھی۔

''اٹھ جا میری دھی، ویلا (وقت) تنگ پڑتا جا رہا ہے۔ بانگوں کو تو بڑا ٹیم ہو گیا۔ شام کی نماز کا وقت تو ویسے بھی تھوڑا ہوتا ہے۔''

وہ خاموش رہی اور کچے فرش کو انگلی سے کریدنے لگی۔

''اٹھ جانی.....کیسے لک (کمر) توڑ کے پڑی ہے۔''

اماں نے اس بار آواز میں تحکم سمو کر کہا تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھی اور پاؤں سلیپر میں گھسیڑ کر ڈھیلے قدموں سے چلتی نلکے کے پاس چلی گئی۔ کنیز نے جھجری اٹھا کر قریب کھڑی عظمت کے سر پہ ٹکائی جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

''جاتے ہوئے مستری اصغر کے گھر پیغام دیتی جانا۔ آ کے ہمارا نلکا ٹھیک کر جائے۔ اللہ جانے کیا نقص پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل گارا (کیچڑ) آنے لگتا ہے، نری مٹی.....ابے کو چار دفعہ یاد کرایا پر اب کو کچھ یاد رہے تب ناں۔''

عظمت سلام کر کے پلٹ گئی تو وہ عائشہ کی جانب متوجہ ہوئی جو ایک ہاتھ نلکے کے ہتھے پر رکھے چپ چاپ کھڑی تھی۔

''چل آ گے ہو۔ وضو کرنا ہے کہ نہیں۔''

وہ چوکی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو کنیز بدھنا اور صابن کی ٹکیا اس کے قریب رکھ کر نلکا چلانے لگی۔

''کنیز! سب سے نکا چوچا (چھوٹا چوزہ) گلی میں نکل گیا ہے۔ بھاگ کے جا۔ کسی سائیکل کے نیچے نہ آ جائے۔''

اماں کی گھبرائی ہوئی آواز پر وہ تیزی سے بھاگی۔

چوزے کو ڈربے میں بند کرنے کے بعد جب وہ لوٹی تو عائشہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ اب تک چوکی پر بیٹھی بڑے انہماک سے جھاگ کے گولے بنانے میں مشغول تھی۔ وہ صابن کے اجلے، سفید اور نرم جھاگ کو چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر ملتی، کچھ دیر جلد پر ہاتھوں کو ایسے جنبش دیتی جیسے رگڑ کر میل اتار رہی ہو، پھر ٹھنڈے پانی کے چھپاکوں سے سفید بلبلوں کو جھاڑ ڈالتی اور نئے سرے سے یہی عمل دہرانے لگتی۔

وہ کچھ دیر یونہی کھڑی اسے ان دیکھا میل دھوتے دیکھتی رہی اور پھر اس کے قریب جا کر نلکے کے گرد چنی ہوئی پختہ اینٹوں کی مینڈھ پر بیٹھ گئی۔

''کون سا میل جما ہے تیرے پنڈے (جسم) پر جسے دھو دھو کے ہلکان ہوئی جا رہی ہے۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بنا بدستور کہنیوں پر صابن ملتی رہی۔

''تجھے کیا ہوا ہے عیشو؟ نماز میں سستی تو کبھی نہیں کی تھی تو نے۔ کل تو نے فجر کی نماز قضا کر دی تھی۔ اب مغرب کے وقت بے فکری بیٹھی صابن سے کھیل رہی ہے۔ سورج چھپے تو بڑی دیر گزر گئی۔ اب کہاں وقت رہا ہے نماز کا۔''

اس نے ایک لاتعلق نظر کنیز کے چہرے پر ڈالی اور پیروں کی انگلیوں میں خوشبودار جھاگ کو رگڑنے لگی۔

''تو بولتی کیوں نہیں؟ گیمبر سے آ کر کتنی گم صم ہوگئی ہے۔ خدا جانے تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ نہ بولتی ہے، نہ ہنستی ہے، کہیں باہر بھی نہیں جاتی۔ عاصمہ کتنی بار آ چکی ہے، بلانے کے لیے۔ آپا کی تیل مہندی سے رخصتی تک ہر ہر رسم میں وہ اور اس کی بہنیں ہمارے ساتھ ساتھ رہی ہیں بالکل سگے رشتے داروں کی طرح اور اب ان کی خوشی کا وقت ہے تو..... یہ صابن کی جان تو چھوڑ دے۔''

کنیز نے جھنجلا کر اس کے ہاتھ سے صابن کی ٹکیہ لے لی۔

''تجھے کیا وہم ہوگیا ہے؟ ایک ہفتے میں تو نے چار ٹکیاں صابن کی گھول ڈالی ہیں۔ کیا بلا چمٹ گئی ہے تیرے جسم سے جسے مل مل کر اتارتی ہے؟''

وہ خاموشی سے اٹھی اور ایک ہاتھ سے نلکے کا ہینڈل چلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے شلوار کا پائنچہ سرکا کر جھاگ میں ملفوف پاؤں دھونے لگی۔ پیر دھو کر وہ مڑی تو کنیز نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

''تیرا دھیان کدھر ہے؟ سر کا مسح تو کیا ہی نہیں تو نے۔''

اس بار بھی کوئی جواب دیے بنا اس نے ہاتھ کا چلو بنا کر نل کے نیچے کر دیا۔ کنیز نے ہتھے کو زور سے نیچے کی جانب دبایا اور اس کی اوک میں بدرنگ پانی گرا۔ عائشہ تیزی سے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹی۔

''پھر وہی مصیبت۔ بس اب نلکے کا پانی نہیں استعمال کرنا، گھر میں کوئی بیمار ہی نہ ہو جائے۔ بجلی گھڑی مڑی (بار بار) نہ جائے تو کوئی دکھ ہی نہیں، موٹر کے پانی سے پنج منٹ میں ٹنکی بھر جاتی ہے۔''

عائشہ نے ہاتھ کو سونگھا اور دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے اس کی طرف یوں دیکھا

جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''اس پانی سے بو آ رہی ہے۔ جیسی گٹروں سے آتی ہے۔ یہ پانی ناپاک ہے۔ نجس ہے۔ اس سے وضو کیسے ہو سکتا ہے۔ وضو تو ہوا ہی نہیں۔ نماز کیسے پڑھوں، بندہ پاک ہی نہ ہو تو نماز کیسے پڑھے۔''

کنیز نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی۔ وہ اس نیلے سے نشان کو بغور دیکھ رہی تھی جو دوپٹہ سرکنے پر اسے عائشہ کی ہنسلی کی ہڈی پر نظر آیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ ہٹانا چاہا تو عائشہ نے یکدم اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ شاید وہ اس کی نظروں کا زاویہ جان گئی تھی۔

''نیل کیسے پڑا تیری گردن پر؟'' اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

عائشہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل بولی۔

''گر گئی تھی۔''

''کیسے گر گئی؟''

''مجھے نماز پڑھنی ہے۔'' اس نے دوپٹے کو سر اور گردن کے گرد سختی سے لپیٹا اور کنیز کو حیران چھوڑ کر کچی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

برساتی میں اندھیرا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیوٹ (چراغ دان) پر سے ماچس کی ڈبیا ڈھونڈی اور ادھ جلی موم بتی روشن کی۔ موم بتی کی زرد روشنی میں چارپائی پر سے تہ کی ہوئی جائے نماز اٹھا کر فرش پر بچھائی، اور قبلہ رو کھڑی ہوگئی۔ تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن کندھوں تک لے جانے سے قبل ہی ڈھیلے چھوڑ دیے۔ جائے نماز کو دوبارہ تہ کر کے چارپائی پر رکھا اور دیوٹ میں جلتی موم بتی پھونک مار کر بجھا دی۔ کچھ دیر وہ یونہی برساتی کی اکلوتی کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی۔ در و دیوار پر حبس پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ املی کی شاخیں بالکل ساکت تھیں۔ چڑیاں بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ سرمئی آسمان پر اکا دکا تارے دکھائی دے رہے تھے مگر وہ بجھے بجھے سے لگ رہے تھے۔ جیسے برف کے بے جان ٹکڑے ہوں۔ روشنی سے عاری اور سرد..... وہ جھلسے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی۔ اور سر کی پشت دیوار کے ساتھ ٹکا کر دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگی۔

''میں کیا کروں.....؟ کیسے نماز پڑھوں، کیسے تیرے سامنے حاضری دوں۔ جب تو ہی نہ چاہے۔ جب تیری ہی رضا نہ ہو تو میری کیا مجال ہے، میں تو تیری پکار پر بھاگی چلی آتی تھی۔ تو

نے خود ہی رستہ روک دیا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرا دل کس قدر زرخیز تھا۔ کیسی کیسی دعائیں پھوٹتی تھیں۔ اب پتہ نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ گلے میں بے شمار آنسو آن بیٹھے تھے۔

''پتا نہیں کیا ہوا۔ مجھ سے کہاں خطا ہوئی۔ تیری مرضی تو جانے..... میں تو ساری زندگی تیرے حکم کے مطابق چلنے کی کوشش کرتی رہی۔ اب کون سا قدم غلط پڑ گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں..... میں اس گندے جسم کے ساتھ تیرے سامنے کیسے آؤں، یہ غلیظ ہاتھ اٹھا کر کیسے کچھ مانگوں۔ مجھے تو دعا مانگنے کا ڈھنگ ہی بھول گیا ہے۔''

اس کے رخساروں پر مسلسل پرحدت قطرے پھسل رہے تھے۔

''پر مانگنا بھی تو کچھ نہیں۔ اب کیا مانگوں گی۔ مانگنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں رہا۔'' اس نے دوپٹہ سرکا کر ہنسلی کی ہڈی کو آہستگی سے چھوا۔ درد کی ایک لہر نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

✠ ✠ ✠

''آپ کو پھر ہیلوسی نیشن.....''

ڈاکٹر فرخ نے بات شروع ہی کی تھی کہ وہ بھڑک کر بول پڑی۔

''ہیلوسی نیشن۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا۔ مجھے کوئی وہم نہیں ہے۔ آپ کو میری بات پر یقین کیوں نہیں آتا۔ اس طرح سے تو آپ کا اور میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جب آپ کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں تو پھر اس لمبی چوڑی بات چیت کا فائدہ۔'' اس نے ناخن چباتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ڈاکٹر فرخ نے تحمل سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''اگر میں محتاط انداز میں بات کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ پہلی بار کب آپ کو شبہ ہوا کہ آپ کے ساتھ یہ مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''یہ سب بے فائدہ ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری پرابلم جس نوعیت کی ہے۔ اس کے لیے کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے کی تو کوئی تک ہی نہیں۔ وہ مجھے زبردستی لے کر آیا ہے جو باہر بیٹھا مجھ پر پہرہ دے رہا ہے۔ میری صاف گوئی آپ کو بری لگے گی۔ لیکن میں اس سارے سلسلے کو بالکل فضول سمجھتی ہوں۔ بھلا ایک ماہر نفسیات اس قسم کی بیماری کا علاج کیسے کر سکتا ہے۔ باتیں کرنے سے تو یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر دیوار پر ٹنگی تصویر کو گھورتی رہی اور پھر اچانک بولی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ کوڑھی کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے جسمانی اعضاء گل سڑ کر گر جاتے ہیں۔ جسم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جیسے پھول سوکھ کر شاخ سے جھڑ جائے۔ کیا واقعی؟''

''کیا آپ مجھے ایسا کوئی زخم یا نشان دکھا سکتی ہیں۔ جس کے بارے میں آپ کا خیال

ہے کہ وہ جذام کے باعث نمودار ہوا ہے۔''

''حیرت ہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں، میرا چہرہ آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھیے۔'' اس نے آستین ہٹا کر بازو ان کے سامنے کر دیا۔

''یہ سفید نشان، میرے سارے جسم پر ایسے ہی، بالکل ایسے ہی دھبے بن گئے ہیں اور میری جلد بے حس ہو گئی ہے۔ کوڑھ میں ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ مجھے بھی درد نہیں ہوتا۔ آپ چاہے چھری سے یہاں پر زخم لگا دیں۔'' اس نے اپنی بے داغ کلائی پر انگلی رکھ کر تیز آواز میں کہا اور اسپنج میں سے ایک سوئی کھینچ کر بازو کی جلد میں گھسیڑ دی۔

''دیکھیں، مجھے درد نہیں ہوتا، یہ دیکھیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے بالکل کوئی احساس نہیں ہو رہا۔'' وہ گیلی آنکھوں کے ساتھ سوئی پر دباؤ ڈالتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر فرخ پرسکون چہرے کے ساتھ بیٹھے اس کے بازو سے پھوٹنے والی خون کی سرخ بوندوں کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''یہ لیجیے۔'' انہوں نے ٹشو کھینچ کر اس کی طرف بڑھایا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''اگر آپ کو گھٹن محسوس ہو رہی ہے تو میں یہ کھڑکی کھول دوں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹشو پیپر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ ان کے متحرک سیاہ بوٹوں کو ساکت پلکوں کے ساتھ گھورتی رہی۔

''آپ کو اللہ کے وجود پر یقین ہے؟'' اس بار اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔

''میرا مطلب ہے، آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ کہ وہ ہے اور جو چاہے جیسے چاہے کر سکتا ہے۔ آپ نے کبھی اسے محسوس کیا ہے۔ اس کی موجودگی کو۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں۔''

کھڑکی کے پٹ وا کر کے وہ دوبارہ ریوالونگ چیئر پر آ بیٹھے اور اس کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس بھری۔

''بہت دفعہ..... شاید ہر روز..... میں رات کو بستر میں جانے سے پہلے اپنے اگلے دن کی بہتری اور آسانی کے لیے دعا مانگا کرتا ہوں۔ اور کسی ایک روز بھی میرے دل میں یہ شک پیدا

نہیں ہوتا کہ میری بات نہیں سنی جا رہی۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ بہت قریب ہو اور بڑے انہماک سے میری بات سن رہا ہو۔''

''آپ جھوٹ بولتے ہیں۔'' اس نے تند لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

''مجھے کسی واعظ کی طرح مت سمجھائیے۔ میں کسی عام انسان کی بات سننا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں، آپ اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر آپ کو اس پر ایمان ہوتا تو آپ اتنے شاندار دفتر میں، قیمتی سامان کے انبار میں گھرے نہ بیٹھے ہوتے۔ اگر آپ کو اس کی پرسش کا خوف ہوتا تو آپ میں اتنی رعونت نہ ہوتی۔ ایسا تکبر نہ ہوتا۔ آپ کو پتا ہے وہ یہیں موجود ہے۔ یہیں کہیں۔ اسی دفتر میں، لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھتا۔ وہ ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھتا۔ میری صورت اتنی مکروہ ہے کہ وہ مجھ پر نظر نہیں ڈالتا۔ جو اللہ جو چھوڑ کر اپنی خواہش کی عبادت کرتے ہیں۔ ان سب کی شکلیں میرے جیسی ہو جاتی ہیں۔ بہت سے کوڑھی پھر رہے ہیں گلیوں میں، سڑکوں پر، بڑے بڑے پلازوں میں۔ بنگلوں میں۔ سب کا کوڑھ نظر نہیں آتا۔ کسی نے خوبصورت چہرے میں چھپا رکھا ہے۔ کسی نے دولت کے ڈھیر میں، کسی نے مرتبے کا پردہ تان رکھا ہے۔ کوئی.....

مجھے لگتا ہے آپ میری بات سننا نہیں چاہتے، آپ کے چہرے پر بے زاری ہے۔'' وہ مٹھی میں بھنچے ہوئے ٹشو پیپر کے ٹکڑے میز کی سطح پر پھینک کر چلائی۔

''میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بولتی رہیے۔ جو آپ کے دل میں ہے کہہ ڈالیے۔''

''جب کسی گھناؤنے اور مکروہ گناہ کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ روک کیوں نہیں دیتا۔ دل کیوں نہیں پھیر دیتا؟ چھوٹی سی نیکی کرنے کی خاطر اتنی مشکلات کیوں سہنا پڑتی ہیں۔ نیک لوگوں کا راستہ آسان کیوں نہیں ہوتا؟'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی تھی۔

ڈاکٹر فرخ نے اسے تسلی دینے کے لیے کچھ نہیں کہا۔ وہ پرسوچ نگاہوں سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو انہوں نے ایک ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس بار اس نے ٹشو پیپر نہیں لیا تھا۔

''میرے خیال میں آپ کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بہتر ہو گا آپ کچھ روز کے لیے کہیں چلی جائیں۔ ان دنوں بالائی سرحد میں بہت اچھا موسم ہوتا ہے۔ آپ تفریح کا پروگرام

بنائیں چاہے تین چار دنوں کے لیے ہی سہی..... کبھی آپ نے اپنا گھر تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا؟''

کسی خیال کے تحت انہوں نے پوچھا۔

''پتا نہیں'' جواب مختصر تھا۔

''گھر تبدیل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ آج کل تو مناسب جگہ پر معقول رہائش ملنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ آپ کم از کم بیڈروم تبدیل کر سکتی ہیں۔ کمروں کی سیٹنگ چینج کر دیں۔ فرنیچر کی ترتیب، پردوں کا رنگ، کچھ نئے ڈیکوریشن پیسز۔ کوئی ایک اِن ڈور پلانٹ، کوئی تصویر وغیرہ۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں لاتے رہنا چاہیے۔ یکسانیت سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے تبدیلی اکثر مثبت نتائج فراہم کرتی ہے۔''

''جذام چھوت کا مرض ہے شاید.....؟''

اس نے کرسٹل کا پیپر ویٹ اپنے قریب کھسکایا۔

''ایک شخص سے دوسرے شخص کو لگ سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے، اس نے مجھے اس بیماری کے جراثیم منتقل کیے ہیں۔ وہی جو باہر بیٹھا ہے۔''

اس کا لہجہ قدرے رازدارانہ ہو گیا۔

''آپ نہیں جانتے بلکہ ابھی تک کسی کو بھی شک نہیں گزرا۔ دراصل اسے بھی کوڑھ ہے۔ میں نے خود اس کے گلتے ہوئے زخموں میں سفید سفید کیڑوں کو رینگتے دیکھا ہے۔ اس پر اتنی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جیسے وہ ایک سڑا ہوا پھل ہو۔ ان کی بھنبھناہٹ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ کہیں مجھے قے نہ آ جائے۔'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک ابکائی لی۔

''لجلجے کیڑے اس کا گوشت چاٹ رہے تھے۔ سخت بدبو تھی۔ تعفن سے میرا سانس بند ہو رہا تھا۔ میں سوچتی ہوں میرا بچہ..... ایسی حالت میں پتہ نہیں..... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے وہ مردہ ہو، جیسے میں بے جان گوشت کا لوتھڑا اٹھائے پھرتی ہوں۔ لیکن نہیں۔ مجھے آپ سے..... کسی سے بھی اس سلسلے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔''

وہ خاموش ہو کر ناخن چبانے لگی۔

''میں ضرور سننا چاہوں گا۔'' ڈاکٹر فرخ کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا ہوئے جیسے

اس کے اس طرح خاموش ہو جانے پر انہیں افسوس ہوا ہو۔

وہ خاموشی سے نظریں جھکائے پیپر ویٹ کو انگلیوں سے گھماتی رہی۔

''جس وقت کا آپ ذکر کر رہی ہیں۔ سوچ کر بتائیے کیا ان لمحات میں آپ کو اپنے شوہر سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ میرا مطلب ہے، یہ بہت نیچرل ہے۔'' وہ پیپر ویٹ کو مزید تیزی سے حرکت دینے لگی۔

''آپ خود کو غیر محفوظ تصور کرتی ہیں؟ کیا آپ کو مختلف لوگوں سے یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کو نقصان پہنچائیں گے یا کبھی آپ کو اپنے شوہر سے خوف محسوس ہوا ہو جیسے وہ آپ کے دشمن ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ جس شخص کے ساتھ بہت عرصے سے رہتے آ رہے ہوں، اچانک وہ بالکل اجنبی لگنے لگتا ہے۔ کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوئے ایلین (دشمن) کی طرح۔''

وہ اس بار بھی چپ رہی۔

''آپ ایجوکیٹڈ ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ دلیل کی زبان سمجھ سکتی ہیں۔ ابھی آپ نے تذکرہ کیا کہ آپ نے اپنے شوہر پر مکھیوں کو بھنبھناتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت آپ کے شوہر بیڈروم میں تھے۔''

اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

''وہ یقیناً رات کا وقت ہو گا۔ آپ کے بیڈروم میں ایئر کنڈیشنر تو ہو گا۔'' وہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کے ہونٹ یوں آپس میں پیوست تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ چپ رہنے کا تہیہ کر چکی ہو۔

''کیا آپ کسی طرح مجھے یہ بات سمجھا سکتی ہیں کہ آپ کے ایئر کنڈیشنڈ بند کھڑکیوں والے بیڈروم میں مکھیاں کیسے آ گئیں۔''

''آپ مسلسل یہی کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے جھٹلا سکیں۔'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کیسے معالج ہیں۔ میرا مسئلہ سمجھنے اور میری رہنمائی کرنے کے بجائے آپ منطق اور دلیل کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ مجھے جو کچھ نظر آتا ہے، میں وہی کہتی ہوں۔ ہم اسے ہی تو سچ کہتے ہیں جو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ جب آنکھوں دیکھا سچ ہوتا ہے تو

میری بات جھوٹ کیسے ہوگئی؟''

وہ چیخ کر بولتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

''میں نے یہاں آ کر صرف اور صرف اپنا وقت برباد کیا ہے۔'' وہ نشست کے ہتھے سے لٹکا شولڈر بیگ پکڑنے کے لیے جھکی تو اس کا ہاتھ لگنے سے پیپر ویٹ لڑھک کر قالین پر گر گیا۔ اس نے پیپر ویٹ اٹھانا چاہا مگر ڈاکٹر فرخ نے ٹوک دیا۔

''کوئی بات نہیں، ابھی ہمارا وقت ختم نہیں ہوا۔ آپ مناسب سمجھیں تو پلیز بیٹھ جائیں۔'' ان کے لہجے کا تحمل اور دھیما پن اب بھی برقرار تھا۔

''اس شیشے کے گولے کو آپ نے قالین پر گرتے دیکھا ہے؟ آپ نے دیکھا ہے ناں، اگر یہ سچ ہے تو جو میں کہتی ہوں وہ بھی جھوٹ نہیں، وہ جھوٹ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں آپ سے کہوں کہ پیپر ویٹ نہیں گرا۔ آپ کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا ہے، آپ کو وہم ہوا ہے تو آپ مان جائیں گے؟ آپ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ سچ نہیں وہم ہے، کیسے مان لیں گے۔'' وہ تیز قدموں سے دروازہ پار کر گئی تھی۔

✠ ✠ ✠

بس کوٹھینگ موڑ سے پتوکی کے لیے روانہ ہوئے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ اباٹھینگ موڑ تک ان کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، ابا سے کہے کہ وہ اس کے ساتھ گیمبر چلیں اور جب تک وہاں رہنا پڑے، اس کے ساتھ ہی رہیں، کالج چھوڑنے کے لیے جایا کریں، واپسی پر لینے کے لیے آئیں، ہر دم سایے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ کلاس روم میں بھی انہیں ساتھ والی نشست پر بٹھا لیتی مگر یہ سب کیسے ہوسکتا تھا۔

وہ تو دل مضبوط رکھنے کا کارآمد گُر اس کی مٹھی میں تھما کر چلے گئے تھے۔ پتہ نہیں دل کیسے مضبوط رکھا جاتا ہے۔ اس کے اندر ان جانے اندیشے کلبلا رہے تھے، کالج کے تصور سے ایک عجیب وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے تو اپنے ہائی اسکول کی آدھی پنجابی، آدھی اردو بولنے والی، بات بے بات ڈنڈے سے دھنائی کرنے والی، شاگردوں کو سر جھکا کر بیٹھنے کا حکم دے کر اپنے آنے والے ننھے یا ننھی کے لیے بنائی کرنے والی، جماہیاں لیتی، میز پر کہنیاں دھر کے اونگھتی ہوئی استانیاں دیکھی تھیں، کالج کی رعب دار اور پر تمکنت شخصیت والی کسی لیکچرار سے آج تک اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ خدا جانے کالج کی 'میڈ میں' کیسی ہوں گی؟

دراز قد، اونچا سا جوڑا، کانوں میں بڑے بڑے بالے، اونچی ایڑیوں والے جوتے پہنے، کالج کے برآمدوں، راہداریوں میں ٹک ٹک چلتی ہوئی، آنکھوں پر نفیس فریم والی عینک، چہرے پر ''دور ہٹو''، ''بچ کے رہنا'' جیسے تاثرات، ڈنڈے سے تو نہیں مارتی ہوں گی مگر عینک کے شیشوں کی اوٹ سے ایسے گھوریں گی کہ بندہ بنا نیل، بنا چوٹ ہی ختم ہو جائے۔ اس قسم کی مخلوق کے ساتھ اس کا گزارا خاصا مشکل تھا۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ ایف اے کی طرح بی اے بھی پرائیویٹ کر لیتی مگر بڑا ہوا انگریزی اور پولیٹیکل سائنس کا جنہوں نے اسے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر ابا کو نہ جانے کیوں یہ وہم سا تھا کہ کالج میں پڑھنے سے اس میں کچھ آفاقی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی، وہ کوئی خاص قسم کی شے بن جائے گی۔ ابا کے برعکس اسے اس طرح کی کوئی امید نہیں تھی۔

اماں نے کتنا احتجاج کیا، اسے تایا جان کے گھر بھیجنے کی تجویز سن کر وہ کس قدر چراغ پا ہوئی تھیں۔ مگر ابا ڈٹے رہے اماں کی رائے کو وہ کبھی بھی اہم نہیں گردانتے تھے۔ ان کے نزدیک معقول مشورہ صرف اسی انسان کے پاس ہو سکتا ہے جو کالج میں کم از کم چھ ماہ گزار چکا ہو۔ وہ خود اس اہلیت سے سرفراز تھے سو اماں کے خدشات کو انہوں نے قطعی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ دل سے وہ بھی اماں کی ہم خیال تھی اور اس نے دبے دبے لفظوں میں یہ بات ابا تک پہنچائی بھی تھی مگر بے سود.....

ان مانے جی سے جب وہ اپنے کپڑے، کتابیں اور ضرورت کی چند دوسری اشیاء اٹیچی کیس میں رکھ رہی تھی تو اسے بار بار رونا آ رہا تھا۔ کیسری چوزے نے، جو اس کا سب سے زیادہ لاڈلا تھا، مکھیوں کے پیچھے ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے ایک دو بار اس کے پیروں پر ٹھونگے مارے تو اس کا جی چاہا کہ اسے بھی باقی سامان کے ساتھ اٹیچی کیس میں رکھ لے۔ لیکن ابا پر تو جلدی سوار تھی۔ اسے کنیز سے یہ کہنے کا موقع بھی نہ مل سکا کہ اس کے چوزے کو روزانہ دو بادام پیس کر یاد سے کھلاتی رہے۔

اور اب وہ اس ٹوٹی کھڑکیوں اور اکھڑی ہوئی سیٹوں والی بس میں تھی جو ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی نہایت سست روی سے چل رہی تھی۔ قدم قدم پہ کوئی اسٹاپ آ جاتا، چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبوں میں بس کئی کئی منٹ ٹھہرتی، ہر دفعہ کنڈکٹر ایک جیسے فقرے دہرا دیتا ''بس بالکل خالی ہے، سب کو سیٹیں ملیں گی۔ آپ بیٹھنے والے تو بنیں۔''

اور سواریاں اس کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتیں۔ انہیں بے جان بوروں کی طرح لدے ہوئے لوگ بالکل دکھائی نہ دیتے، ایک دوجے کے پاؤں کچلتے، دھکے دیتے، بکتے جھکتے وہ کسی ان دیکھے خلا میں سما ہی جاتے اور بس ایک دھچکے کے ساتھ پھر سے چل پڑتی۔

پیلی دھوپ مکئی کے کھیتوں پر پنکھ پھیلائے اونگھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف کیکر اور ٹاہلی کے پیڑ دھوپ میں کملائے ہوئے تھے۔ بیہ کے بیضوی ساخت کے بھورے گھونسلے کیکر کی

خاردار شاخوں اور ٹاہلی کی باریک ڈالیوں سے لٹکے ہوئے، گرم ہوا کے تھپیڑوں سے ادھر ادھر ڈول رہے تھے۔ کبھی کبھار کیکر کے زرد اون سے بنے ہوئے پھندنوں جیسے پھول ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے کھلی کھڑکی سے اس کی گود میں آ گرتے۔

اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ بڑی سی چادر میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے ساتھ بیٹھے عجی کو دیکھا۔ جو اگلی نشست سے پیشانی ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ اس کی آسمانی قمیص پسینے سے بھیگ کر کمر سے چپک گئی تھی۔ بس کوئی زوردار قسم کا جھٹکا کھاتی تو وہ دائیں یا بائیں لڑھک جاتا۔ وہ ہر بار بس رکنے پر اس کی طرف پرامید نظروں سے دیکھتی، اس آس پر کہ وہ پوچھے گا۔ ''پیاس تو نہیں لگی؟'' لیکن پہلو میں جھولنے اور ایک دو بار نشست سے جدا ہو کر ہوا میں اچھلنے کے باوجود اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ خود سے کہنے کی ہمت اسے نہیں ہو رہی تھی۔ عجی کی تیز مزاجی سے اچھی طرح واقف تھی۔ چند دفعہ پہلے بھی اس کے ساتھ سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ سفر کے دوران پانی پینے یا واش روم ڈھونڈنے کی فرمائش سن کر وہ فرمائش کرنے والے کو یوں گھورتا جیسے کچا ہی کھا جائے گا۔ خالہ کے منجھلے بیٹے آصف کو تو اس نے ایک بار بس میں برف کا گولہ دلانے کے لیے ضد کرنے پر ہلکے ہاتھ کے دو تھپڑ بھی لگا دیئے تھے۔ یہی سب سوچ کر وہ اب تک خاموش بیٹھی تھی۔

بس چونیاں شہر میں رکی تو کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں دیکھ کر اس کی پیاس یک لخت حد سے سوا ہو گئی۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر عجی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سابقہ حالت میں تھا۔

''عجی!'' اس نے آہستگی سے آواز دی۔

چند بار اور بلانے پر جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور بس بھی روانگی کے لیے پر تولنے لگی تو مجبوراً اس کا کندھا دھیرے سے ہلایا۔

اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

''پتو کی آ گیا؟''

''مجھے پیاس لگی ہے۔''

اس کی نظروں کا زاویہ فوراً تبدیل ہوا۔ چند لمحے وہ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا اور

پھر حسب توقع دھاڑا۔

''تم پینڈو عورتوں کو سفر میں بڑھ بڑھ کر بولنے کی بڑی خراب عادت ہوتی ہے چپ سے منہ بند کر کے بیٹھنا تو آتا ہی نہیں۔''

وہ سہم کر چپ ہو رہی۔ تمام سفر میں یہ پہلا جملہ اسے مخاطب کر کے بولا تھا اور بول کر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

''پتو کی چل کے پی لینا پانی۔ اب تیری خاطر ساری بس رکی رہے گی۔ مجھے پہلے پتا ہوتا تو کولر ساتھ لے کے چلتا۔''

اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

''ٹھیک ہے۔ پتو کی پہنچ کے پی لوں گی۔'' اس نے تھوک نگل کر کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''کیا ٹھیک ہے؟ اب تو پتو کی تک دل میں مجھے کوستی رہے گی اور صبر کے بڑے بڑے گھونٹ پیے گی، خود پر ترس کھائے گی۔ یہ سارا کچھ کرنے کی بجائے تو کہہ کیوں نہیں دیتی کہ ناں جی، میں تو صبر نہیں کر سکتی۔ ابھی پانی پیوں گی، اسی وقت، ہر قیمت پر، چاہے ساری دنیا کا نظام رک جائے۔ ہونہہ ٹھیک ہے جی۔''

وہ ہنکارا بھر کے نشست سے اٹھ گیا تھا۔

وہ بدستور کھڑکی کی جانب رخ کیے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے گھٹنے پر رکھے اپنے ہاتھ کی پشت پر جوس کے ڈبے کی خوشگوار گیلی ٹھنڈک کو محسوس کیا تھا۔ بس سابقہ سست روی سے چل پڑی تھی۔

''داخلہ فارم تو نے خود پُر کیا تھا؟'' خالی ڈبہ باہر پھینکتے ہوئے عجی نے پوچھا۔

''جی۔''

''سارے ہجے غلط، لکھائی جیسے پیر کی انگلیوں میں قلم پھنسا کر خطاطی کی ہو۔ مجھے بڑی شرم آ رہی تھی تیرا فارم کلرک کو پکڑاتے ہوئے۔ وہ پوچھ لیتا کہ بھائی کس پاگل خانے کو داخل کرانے لگے ہو یہاں جسے اپنے علاقے کا نام بھی ٹھیک لکھنا نہیں آتا تو میری کتنی بے عزتی ہوتی۔ کنگن پور میں تو نے گاف کے تین ڈنڈے ڈالے تھے۔ بندہ پوچھے یہ اردو کا کون سا حرف ہے جس میں تین

ڈنڈے آتے ہیں۔''

وہ بتا سکتی تھی کہ تیسرا 'ڈنڈا' دراصل زبر تھا لیکن اس وقت اسے صرف اس ٹھنڈے مشروب سے دلچسپی تھی جسے وہ گھونٹ گھونٹ حلق میں اتار رہی تھی۔

''تجھے کس اللہ کے بندے نے کالج میں پڑھنے کا مشورہ دے دیا؟ ابھی لکھوا لے مجھ سے، کالج میں پڑھ کر بھی تو اتنی ہی جاہل اور بے وقوف رہے گی جتنی اب ہے۔ تجھ جیسی پینڈو لڑکیاں شہر کے طور طریقے سیکھ بھی جائیں تو ان کا پینڈو پنا ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دکان پر ٹافی خریدنے جائیں گی تو کہیں گی 'شاپ کیپر بھائی ذرا میٹھی گولیاں تو دیجئے گا''۔ ون وے سڑک پار کرتے ہوئے بھی دونوں طرف دیکھنا نہیں بھولتیں اور کہیں جو کوئی گاڑی اپنی طرف آتی دیکھ لیں تو ہائے اللہ کہہ کر سڑک کے درمیان کھڑی ہو جائیں گی۔ یہ تو حال ہے تم لوگوں کا۔''

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ''پتا نہیں منہ میں زبان بھی ہے یا گونگی پیدا ہوئی ہے۔''

پتوکی سے اڈا گیمبر تک کا سفر نسبتاً بہتر تجربہ تھا۔ مگر بس بہرحال بس ہوتی ہے۔ اس کا مخصوص ماحول کبھی بھی پیش منظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔

بس اسٹاپ سے تایا جی کے گھر تک سات آٹھ منٹ کا پیدل راستہ تھا، جامع مسجد والی گلی سے گزر کر جب وہ بجھے ہوئے نیلے رنگ کے دروازے اور سفید چونے سے پتی دیواروں والے پختہ مکان کے سامنے پہنچے تو سفر کی کوفت اس کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو چکی تھی۔ وہ فوراً ہی کسی چارپائی پر گر کے بے سدھ ہو جانا چاہتی تھی۔

دروازہ کھلا تھا، پختہ اینٹوں کا ناہموار فرش جس پر جا بجا خشک ہونٹوں سے اترتی پپڑیوں کی مانند سیمنٹ اکھڑا ہوا تھا۔ ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ صحن میں تائی جان بان کی کھری چارپائی پر کہنی کے بل دراز تھیں۔ ان کے بالوں میں مہندی لگی تھی۔ جسے سکھانے کے لیے وہ دھوپ میں لیٹی تھیں۔ برآمدے کی چقیں اٹھی ہوئی تھیں۔

صدف باورچی خانے کے دروازے میں فرش پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی اٹھی اور آ کر اس کے گلے لگ گئی۔

تائی اماں چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ ضرور گئی تھیں مگر ان کے چہرے پر مسکراہٹ کے

کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔اس کے سلام کا جواب بھی انہوں نے اتنی مدھم آواز میں دیا کہ وہ سن نہ سکی۔صدف دوبارہ ترکاری بنانے بیٹھ گئی تھی۔

عجی اس کا اٹیچی کیس برآمدے میں رکھ کر باہر چلا گیا تھا۔وہ تائی جان کے پاس چارپائی کے ایک سرے پر ٹک گئی۔

''پتوکی زیادہ نزدیک نہیں پڑتا تھا، بھلے تم روز آتی جاتیں۔وہاں تو بہت بڑا لڑکیوں کا کالج ہے۔ادھر بڑی مصیبت ہے،فوجی چھکڑا یہاں گیمبر تک تو آتا ہی نہیں۔صدف کو روز ایک ڈیڑھ کلومیٹر پیدل چل کے چیک پوسٹ جانا پڑتا ہے۔واپسی پر پھر وہی کھچل (مشقت)۔پاس بنوانا پڑتا ہے۔نہیں تو ڈرائیور گاڑی میں بیٹھنے نہیں دیتا۔پتوکی میں داخلہ لے لیتیں تو گھر سے دوری تو نہ سہنی پڑتی۔پردیس پھر پردیس ہوتا ہے۔چاہے گلیاں سونے کی اینٹوں سے ہی کیوں نہ بنی ہوں اور شہر کے مینارے چاندی کے ہوں۔سو اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔بھائی کریم نے پتا نہیں کیا سوچ کر تمہیں ادھر داخل کروادیا ہے۔''

تائی جان نے آتے ہی اسے باور کرادیا۔کہ وہ اس کے آنے سے خوش نہیں ہیں۔ان کا رویہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ تائی جان ان کے گھر کے کسی بھی فرد کو پسند نہیں کرتی تھیں۔

''پتوکی بڑا دور پڑتا ہے۔ادھر سے پہلے کنگن پور سے ٹھینگ موڑ آؤ۔پھر آگے پتوکی کے لیے دو جی بس پکڑنی پڑتی ہے۔سفر تو تھوڑا ہے، پر ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ابا کہتا تھا ہاسٹل میں نہیں رہنا، اس لیے جی''

وہ جلد از جلد وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی مگر اس خواہش پر عمل نہیں کرسکتی تھی۔تائی جان دوبارہ پہلے والے انداز میں لیٹ کر سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگی تھیں۔وہ یوں لاتعلق ہو چکی تھیں جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ اپنی موجودگی کو کس طرح سے ظاہر کرے۔صدف نے بھی رسمی سوالوں کے بعد چپ سادھ لی تھی۔اس وقت اس کی تمام تر توجہ پیازوں اور آلوؤں پر تھی۔

''تایا جی کہاں ہیں؟'' آخر کار اسے ایک فقرہ سوجھ ہی گیا۔

''مولوی صاحب کی بچی فوت ہوگئی ہے۔جنازے کے ساتھ قبرستان گئے ہیں۔''

پھر وہی خاموشی اس کے چاروں اطراف گردش کرنے لگی۔

جامع مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔اسی دم عجی سیون اپ کی دو بوتلیں پکڑے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔اسے جس طرح چھوڑ گیا تھا، اسی حال میں بیٹھے دیکھ کر اس نے بے اختیار پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''او تو اب تک ویسے ہی بکل مار کے بیٹھی ہے۔گرمی نہیں لگتی تجھے یہ لوئی تو اتار دے۔اندر چل کے ایئر کولر کے آگے بیٹھ۔چل اٹھ۔''

''میں نماز پڑھ لوں۔''

''بالکل پڑھ نماز حاجن بی بی۔ہمارے لیے بھی دعا کر دینا۔صدف! تو نے اسے پانی شانی پلایا ہے یا اب تک پیاسی بیٹھی ہے۔لے یہ بوتلیں پکڑ، دودھ سوڈا بنا دے جلدی سے۔''

اس نے چادر اتار کر الگنی پر ڈال دی اور اٹیچی کیس سے دوپٹہ نکال کر وضو کرنے غسل خانے میں چلی گئی۔

جب وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی تو عجی دودھ سوڈے کا گلاس لیے پہنچ گیا۔

''کتنی لمبی نماز پڑھتی ہے تو؟ اتنی دیر میں تو لوگ چار نمازیں پڑھ لیتے ہیں۔'' اس نے جائے نماز سمیٹ کر گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''ہانڈی بننے میں ابھی دیر ہے۔میں بازار سے سالن اور روٹیاں لے آتا ہوں، بتا کیا کھائے گی۔آلو قیمہ، پائے یا نان حلیم لے آؤں؟''

''جو تمہارا دل کرے، لے آؤ۔''

''کیوں جی، تیری کوئی مرضی نہیں؟'' وہ خاموش رہی۔

''بتانی پڑتی ہے مرضی، کسی کو کیا پتا اگلے بندے کے دل میں کیا ہے۔''

عجی قدرے جھجک کر معنی خیز لہجے میں بولا تھا۔وہ بلا ضرورت نواڑی پلنگ پر رکھے سرہانے کی شکنیں درست کرنے لگی۔

''اب میرے واپس آنے تک اکڑ کے بیٹھی نہ رہنا۔ٹھنڈی ہوا میں آرام کر، تھکن اتار لے۔میں بس ابھی دو منٹ میں آرہا ہوں۔''

جاتے ہوئے وہ ایئر کولر آن کر گیا تھا۔تھکن سے چور تو وہ تھی ہی، خوشگوار نم ہوا نے اس

کے اعصاب کو تھپکنا شروع کیا تو جلد ہی غنودگی طاری ہوگئی۔ بوجھل ذہن میں سفر کے واقعات، اماں ابا اور کنیز کی باتیں، کیسری چوزہ، اپنے گھر کے آنگن میں لگے ہوئے سیوتی کے پھول، تائی جان کا کوفت زدہ چہرہ، کالج کی اونچے جوڑے والی میڈ میں، باچھیں پھاڑ کر قہقہے لگاتی تیز طرار لڑکیاں اور کالج کے بڑے بڑے کمرے، کسی بار بار ریوائنڈ ہوتی فلم کی طرح مرتسم ہو رہے تھے۔ یہاں گزرے ہوئے تھوڑے سے وقت سے ہی اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ آئندہ کے حالات بہت مشکل ہوں گے۔ ساتھ والے کمرے سے تائی جان اور صدف کے باتیں کرنے کی مدھم اور غیر واضح آوازیں آ رہی تھیں۔ ایئر کولر کی گھوں گھوں اور مغربی دیوار کے ساتھ رکھے ڈیپ فریزر کی دھیمی سرر سرر کسی لوری کی مانند اس پر نیند وارد کر رہی تھی۔ بتدریج مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں بدلتی آوازوں نے اسے بہت سی پریشان کن سوچوں سے چھٹکارا دلا دیا۔ عجی کے لوٹنے سے قبل ہی وہ سو چکی تھی۔

وہ بیدار ہوئی تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تایا جی گھر آ گئے تھے۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ لیکن وہ اسے پاس بٹھائے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات کو اس نے سب کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔

تایا جی عشاء کی نماز پڑھنے مسجد گئے تو وہ چارپائیاں بچھانے میں صدف کا ہاتھ بٹانے لگی۔ تائی جان نے دونوں چقیں گرائیں اور صدف کو مخاطب کر کے بولیں۔

''عائشہ کا بستر اندر بڑے کمرے میں بچھا دینا۔ اس بے چاری کو کہاں عادت ہے ایئر کولر کے آگے سونے کی۔ کہیں ٹھنڈ ہی نہ لگ جائے۔'' ان کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا طنز تھا۔

''برآمدے میں پانچ چارپائیاں آ بھی نہیں سکتیں۔ خوامخواہ آنے جانے میں تنگی ہوگی۔ رات کو دو تین دفعہ تو ضرور ہی جاتے ہیں تمہارا ابو غسلخانے میں۔ اندھیرے میں چارپائیوں سے ٹھڈے کھاتے پھریں گے۔''

وہ خاموشی سے اندر آ کر اسی نواڑی پلنگ پر لیٹ گئی جس پر دوپہر میں سوئی تھی۔ بے شک ان کے گھر میں ایئر کولر نہیں تھا اور ہو سکتا تھا کہ رات کو اسے ٹھنڈ بھی محسوس ہوتی مگر تائی جان کی بات نے اسے بہت دکھ دیا تھا اس نے سست روی سے اور قدرے ڈول کر گھومتے ہوئے چھت کے پنکھے کو دیر تک گھورتے رہنے کے بعد آنکھیں میچ لیں۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے تو بھرپور نیند لے کر بیدار ہوئی تھی۔ کروٹوں کا ایک طویل سلسلہ اسے پلنگ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک منتقل کرنے لگا۔ نہ جانے رات کے کس پہر اسے ہلکی سی اونگھ آئی تھی کہ کسی کے بلند آواز میں بولنے پر چونک گئی۔

''اسے گرمی نہیں لگتی؟ ان کے گھر میں ایئر کولر نہیں ہے تو کیا ہوا۔ یہاں تو ہے نا، وہاں پر کھلی ہوا ہوتی ہے۔ ہمارے مکان سے ان کا گھر بہت بڑا ہے۔ اس طرح کا بند بند کگڑیوں کے کھڈے (ڈربے) جیسا نہیں ہے۔ اندر چاہے گرمی سے اس کی جان نکل جائے۔ چل او صدف! اٹھ تو اسے باہر لے کر آ۔ میں سو جاتا ہوں اندر۔''

یہ عجی تھا جو بہت غصے میں لگتا تھا، شاید وہ ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔

''آہستہ بولو، تمہارے ابو جاگ جائیں گے۔ اور تمہارے دل میں جو ابال اٹھ رہے ہیں۔ ان کی وجہ مجھے خوب معلوم ہے۔ نہیں مرتی وہ۔ کل سے وہ اکیلی سو جائے گی، ایئر کولر کے آگے۔ ہم سب اندر لیٹیں گے۔ بہن کو نہ بے آرام کر۔ سارے دن کی تھکی ہوئی ہے۔'' تائی جان گھٹی گھٹی آواز میں اسے گھرک رہی تھیں۔

''بے آرام نہ کر۔'' کچھ دیر تک عجی کی بڑبڑاہٹ اور کچھ کھڑ پٹر اس کے کانوں تک پہنچتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اسے اپنے حلق میں آنسوؤں کی نمکینی محسوس ہوئی تھی۔ صبح تک وہ جاگتی رہی تھی۔

اگلے روز اتوار تھا، یہ تمام دن کمرے میں بیٹھے بیٹھے گزارا۔ رات کو سونے کا وقت ہوا تو وہ خود ہی اپنا بستر اندر بچھانے لگی۔ صدف نے اسے برآمدے میں لیٹنے کے لیے کہا۔ لیکن وہ آہستگی سے بولی۔

''مجھے سردی لگے گی رات کو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

وہ کندھے اچکا کر چلی گئی تھی۔

✠ ✠ ✠

عفت آرا اس کے ساتھ قدم ملانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ مگر سرمئی سنگریزوں کی فراخ پٹی تھی کہ پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے تھکن زدہ نظروں سے تیزی سے دور ہوتی جاثیہ کو دیکھا تھا۔

یک لخت وہ رک گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

''امی! اس طرح پاؤں گھسیٹنے سے بہتر تھا، آپ واک کرنے کی ہامی ہی نہ بھرتیں۔ ذرا تیز چلیں۔ چستی سے موسم کی خوشگواریت کو محسوس کریں، مارے باندھے مشقت سمجھ کر واک کریں گی تو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ الٹا تھک جائیں گی اور دو چار روز میں جی اکتا جائے گا۔'' اس نے قدموں کی رفتار دھیمی کر دی تھی۔

''میرے بائیں ٹخنے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے جلتا انگارہ رکھ دیا ہو کسی نے۔ تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ مجھ میں اتنی سکت کہاں کہ دو تین کلومیٹر اچھلتے کودتے طے کر لوں۔ تم تو پیچھے دیکھے بنا بھاگی ہی چلی جا رہی ہو۔ میں چاہے سڑک پر ڈھیر ہو جاؤں تمہیں کوئی پروا ہی نہیں۔ واک کرنا ضروری ہے۔ ٹھیک ہے، کر رہے ہیں، پر ایسی بھی کیا آفت آئی ہے کہ سارے علاقے کا گشت کر ڈالا۔''

وہ اس کے قریب آتے آتے ہانپنے لگی تھیں۔ ان کے لہجے میں ناراضی کو محسوس کر کے جاثیہ مسکرائی۔

''بلڈ شوگر آخری حد تک۔ بی پی آپ کا کبھی نارمل نہیں ہوا۔ ہاتھ پاؤں بیٹھے بیٹھے سن ہو جاتے ہیں۔ نمک اور چکنائی کا استعمال آپ کم نہیں کر سکتیں، چوری چھپے مٹھائی بھی کھا لیتی ہیں لیکن کبھی کبھار۔ اب واک کرنے سے بھی آپ کا جی گھبراتا ہے تو ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن

دل گھبرا رہا ہے، سر گھومتا ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہے ٹائپ شکایتیں مجھے نہ سنایا کریں۔''

''یہ بیماری تو جان کا روگ ہے۔ جان جائے گی تو پیچھا چھوٹے گا۔''

وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائیں۔

سڑک دور دور تک ویران نظر آتی تھی۔ خوشگوار، خنک ہوا سرکنڈے کے جھاڑوں میں سے گزرتی ہوئی مبہم سرسراہٹیں پیدا کر رہی تھی۔

جب وہ گھر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑنے لگیں تو ایک گاڑی مخالف سمت سے آئی اور زن سے ان کے قریب سے گزر گئی۔

''انڈیکیٹر تک نہیں جلایا الو کے پٹھے نے۔'' جاثیہ نے ایک پتھر کو پیر سے ٹھوکر لگا کر دانت پیسے۔

''ہر گھوڑے گدھے کو پتا نہیں ڈرائیونگ لائسنس کیسے مل جاتا ہے۔'' عفت پھر دس بارہ قدم پیچھے رہ گئی تھیں۔ وہ خود واپس ان کے پاس چلی گئی۔

''کس قدر ویرانی ہے۔ ساری سڑکیں سنسان پڑی ہیں اور ہم دو نہتی عورتیں پاگلوں کی طرح بھاگی پھر رہی ہیں۔ کل سے جلدی نکلنا گھر سے۔ یہ وقت بالکل مناسب نہیں۔ آج کل حالات بہت خراب ہیں۔''

''حالات تو کبھی بھی درست نہیں ہوتے۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''آپ بس کسی بہانے اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے میں آٹھ بجے والا ڈرامہ قربان کرنے پر رضامند نہیں ہوں گی۔ آپ کے ہاتھ بہانہ لگ گیا ہے۔ ویرانی اور حالات کی خرابی والا۔ یہ جھنجھٹ تو خود بخود ہی ختم ہوگا۔''

عفت نے اچانک ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کو کہا۔

''چپ۔ مجھے کچھ عجیب سی آواز سنائی دی ہے۔''

چند لمحے خاموش رہ کر وہ آس پاس کسی غیر معمولی شے کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر مصنوعی خوفزدگی سے بولی۔

''خوامخواہ مت ڈرائیں مجھے۔ ویسے آپ کو ڈر کس بات کا ہے؟ میں جو آپ کے ساتھ

ہوں۔ پریشانی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔''

''یہ ہی تو پریشانی کی اصل وجہ ہے۔ کبھی بھیڑوں کی رکھوالی بھیڑ سے بھی ہوئی ہے؟ اس سڑک کی تینوں لائٹس کئی دنوں سے خراب ہیں۔ کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔ چند قدموں کے فاصلے تک کچھ دکھائی نہیں.....'' ان کا جملہ نامکمل رہ گیا۔ ان دونوں کو رک جانا پڑا تھا۔ ان سے چند فٹ دور سڑک کے بائیں کنارے کوئی شخص پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔

چند لمحوں تک وہ دونوں بالکل ساکت سانس روکے کھڑی رہیں۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے سڑک نے ان کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔

پھر جاشیہ نے اپنے بازو پر عفت کی لرزتی گرفت کو محسوس کیا تھا، وہ اسے پچھلی سمت میں کھینچ رہی تھیں۔

بنا کوئی آہٹ پیدا کیے وہ الٹے قدموں اس مقام سے دور ہٹنے لگیں۔

''پلیز ہیلپ می۔ فار گاڈ زسیک۔'' اس شخص نے کراہ کر پکارا تھا۔ اب وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جاشیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں برفیلی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ حلق سے نکلتی چیخ کو بمشکل دبا کر وہ پوری قوت سے بھاگ پڑی۔ عفت نے اب تک اس کا بازو دبوچ رکھا تھا۔

''پلیز رک جائیں۔ میں زخمی ہوں۔ پلیز میری مدد کریں۔''

وہ آنکھیں بند کر کے بھاگتی رہی۔ کچھ دیر کے لیے وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی کہ امی اس کے ساتھ تھیں۔

''میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں۔ پلیز میری بات سنیں۔ ڈریں مت۔'' پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ شخص تکلیف میں تھا۔

سڑک کے موڑ پر رک کر وہ کچھ دیر سانس درست کرتی رہی۔ عفت بھی گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچ گئی تھیں۔

''رکو مت۔ بھاگو، کہیں اس آدمی کے پاس پسٹل وغیرہ نہ ہو۔'' عفت نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا لیکن وہ تھمی رہی۔

''تم کون ہو؟ ہم کیسے یقین کر لیں کہ تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔'' اس نے

چلا کر پوچھا تو عفت نے بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا کر رہی ہو؟ اس طرح فریب دے کر لوگ وارداتیں کرتے ہیں۔ پاگل ہو گئی ہو؟'' ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''مجھے کیا معلوم آپ کیسے یقین کریں گی۔ نہ بھی کریں تو کوئی بات نہیں۔ میں خود ہی.....''

''آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟''

اس کی طرف سے خاموشی چھائی رہی۔

''اچھا میں آ رہی ہوں۔''

وہ اب بھی خاموش تھا۔

اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو عفت اس کے ساتھ یوں چمٹ گئیں جیسے اسے گود میں اٹھانا چاہتی ہوں۔

''خبردار۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''امی! شاید وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کس قدر گہرے زخم ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ گاڑی والا اسے ٹکر مار گیا ہو جو اندھوں کی طرح ڈرائیو کر رہا تھا۔''

اس نے زبردستی خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا۔

محتاط قدموں سے چلتی ہوئی وہ دوبارہ اس جگہ پہنچی تو وہ شخص سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا دل اب بھی غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور اس کے قریب جاتے ہوئے وہ خوف محسوس کر رہی تھی۔

''میں تو سمجھی..... میں سمجھی شاید آپ بے ہوش ہو گئے ہیں۔'' آواز کے ارتعاش کو چھپانے میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

وہ چپ رہا تھا۔

''آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔

اس کی خاموشی سے جاشیہ کا دل ہولنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر سرپٹ

دوڑ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ ایک بڑے پتھر پر نظر پڑتے ہی اس نے غیر محسوس انداز میں جھک کر پتھر اٹھالیا اور ڈرتے ڈرتے دو قدم اٹھا کر اس کے مزید قریب ہوئی۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ یہ پتھر میرے سر میں مار دیجئے۔ جو کسر رہ گئی ہے آپ پوری کر لیں۔''

اس کے اس طرح اچانک چلانے پر جاشیہ اچھل کر پیچھے ہٹی تھی۔ ''مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں۔''

وہ سخت جھنجھلایا ہوا لگتا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ دراصل میں اور امی آپ کو سڑک کے کنارے لیٹے دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوگئی تھیں۔''

وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ کہہ رہے تھے، آپ زخمی ہیں۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہا تھا، میرا بازو چیر کے رکھ دیا۔ چاقو تھا اس کے پاس۔''

اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے پر مثبت تکلیف کے تاثرات دیکھ سکتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سختی سے بازو پر جما رکھا تھا۔ وہ کسی گہرے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا، اس لئے وہ فوری طور پر زخم کی جگہ کا اندازہ نہیں کر سکی۔

''یہاں زخم لگا ہے؟''

اس کے بازو کی طرف اشارہ کر کے اس نے اونی شال کندھوں سے اتاری۔

''میں یہ دوپٹہ باندھ دیتی ہوں۔ پھر آپ ہمارے گھر چلیے گا۔ یہاں اندھیرے میں تو کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔''

''جاشیہ!''

امی کا آواز کا کوئی جواب دیئے بنا وہ شال کو اس جگہ سے کچھ اوپر باندھنے لگی تھی جہاں اس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ دو مضبوط گانٹھیں دے کر وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

''امی! آپ وہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟ ادھر آ کر میری مدد کریں۔ اس کے لمبے چوڑے وجود کا ذرا سا بوجھ پڑنے سے ہی وہ دوہری ہوگئی تھی۔

وہ دانت پر دانت جمائے قدرے لڑکھڑاتا ہوا سڑک تک پہنچا اور اس کے کندھے سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''میں خود چل سکتا ہوں۔''

گھر پہنچنے تک ان تینوں میں سے کسی نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ امی کی خاموشی کا مفہوم وہ سمجھتی تھی، لیکن فی الحال اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

''امی! آپ جا کر مبشر کو بلا لائیں۔ وہ کلینک سے آ چکا ہوگا۔ میں اتنی دیر میں زخم دھو دیتی ہوں۔'' انہوں نے کی ہول میں چابی گھما کر دروازہ ایک جھٹکے سے اندر دھکیلا اور اسے فہمائشی نگاہوں سے گھورتے ہوئے گویا بادل نخواستہ پلٹ گئیں۔

روشنی میں اس نے پہلی بار اس اجنبی کا چہرہ دیکھا تو بہت دیر تک نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اس نے اتنا خوبصورت چہرہ آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نقوش کسی دیوتا کی تمکنت لیے ہوئے تھے۔

''وہ شاید کوئی نشہ کرنے والا تھا، میرا والٹ لے گیا۔'' اگر وہ نہ بولتا تو شاید کچھ دیر اور اس کی محویت نہ ٹوٹتی۔

''میری گاڑی یہاں سے کچھ دور خراب ہوگئی تھی۔ میں اس علاقے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔ بس اچانک ہی کسی درخت کے پیچھے سے نکل کر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔''

وہ نقاہت بھرے لہجے میں ٹوٹی پھوٹی تفصیل بتانے لگا۔ اس کی بھوری قمیص کی آستین خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ پینٹ پر بھی گھٹنے تک خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ جاشیہ کچھ کہے بغیر تیزی سے کچن میں چلی آئی۔

بڑی عجلت میں اس نے بینڈیج کا رول تلاش کیا، چھوٹے ٹب میں گرم پانی بھرا اور ڈیٹول کے چند قطرے ڈال کر بھاگتی ہوئی واپس آ گئی۔ وہ اس کا چہرہ ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ آستین ہٹا کر زخم کا جائزہ لے رہا تھا۔ زخم گہرا تھا، یا ہلکا، وہ نہیں جان سکی۔ اس کا بازو صاف کرتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس کی ساری توجہ زخم کی جانب تھی۔ اس لیے جاشیہ کو براہ راست اس کی طرف دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

''آپ نے اپنا نام اب تک نہیں بتایا۔ اس کے بازو پر بینڈیج لپیٹتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''اونیل جان۔''

نہ جانے کیوں اس کا نام سن کر اسے دھچکا سا لگا تھا۔

''آپ..... آپ مسلم ہیں؟''

''جی نہیں..... میں کرسچن ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے دل کو رکتے ہوئے پایا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند چکا تھا۔

اگلے چند لمحوں میں اس نے ہر اس چیز پر نگاہیں جمانے کی کوشش کی تھی جو اس کے اردگرد موجود تھی۔ گلدانوں پر، کھڑکیوں کے پردوں پر، چھت کے ساکت پنکھے پر، گرتے ہوئے چونے والی دیواروں پر، اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر مگر ہر بار وہ ناکام رہی۔ ہر بار غیر محسوس طریقے سے اس کی نظریں اونیل کے چہرے پر رینگ جاتیں۔

عفت اکیلی ہی واپس آئی تھیں۔ مبشر ابھی کلینک سے نہیں لوٹا تھا۔ انہوں نے فون پر اسے آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

''آنٹی! آپ کا بہت شکریہ، میں اب خاصا بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ خون تو رک ہی گیا ہے۔ زیادہ گہرا زخم نہیں ہے۔''

اس نے سرخ ہوتی ہوئی پٹی کو ایک نظر دیکھا۔ ''میں چلا جاؤں گا۔ مجھے ذرا گائیڈ کر دیجیے، کنوینس کہاں سے ملے گی؟''

''ہمارے گھر کے بائیں طرف جو سڑک ہے، اس پر سیدھے چلے جاؤ۔ ایک لین چھوڑ کر چوراہا آئے گا۔ وہاں سے ویگن مل جائے گی۔''

انہوں نے مروتاً بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''آپ کو میری وجہ سے بہت زحمت ہوئی۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو جاشیہ بے اختیار بول پڑی۔

''مبشر بس آتا ہوگا۔ وہ آپ کو بائیک پر چھوڑ آئے گا اور ضرورت ہوئی تو کلینک بھی.....''

''مبشر کی بائیک خراب ہے۔'' عفت نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

اونیل ہونٹ بھینچے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

جاشیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیسے اسے روک لے۔ اگر امی اتنی سرد مہری سے پیش نہ آتیں تو وہ کچھ دیر اور اسے دیکھ سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ دوبارہ کبھی ملے گا بھی یا نہیں۔

اچانک ایک خیال آنے پر وہ بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی اور پھر اسی رفتار سے اونیل کے پیچھے باہر نکل گئی۔

عفت نے اسے روکنے کے لیے آواز دی تھی مگر اس نے ان سنی کر دی تھی۔

''یہ لے لیجیے۔''

وہ رک کر مڑا تھا۔ جاشیہ کے ہاتھ میں کچھ روپے تھے۔

''آپ کو پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ رکھ لیں۔''

اونیل نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ سے روپے لے لیے۔

''مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میرے پاس ویگن کے کرایے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔''

وہ ساکت پلکوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

جب تک وہ نظر آتا رہا، وہ وہیں کھڑی رہی۔

اس کے عقب میں قدموں کی آہٹ ہوئی تو وہ اندر جانے کے لیے مڑی، امی کے ماتھے کی شکنیں ان کی خفگی کی غماز تھیں۔ اندر آتے ہی وہ اس پر برس پڑیں۔

''بے وقوفی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ مبشر کو بلا لائیں۔ میں پاگل تھی جو اسے فون کرتی، سارے محلے میں مشہوری کر دیتا وہ۔ پرکا کوا بنانا لوگوں کو خوب آتا ہے۔ کیا کیا کہانیاں بنتیں، کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ میں نے ساری زندگی محتاط رہ کر گزاری ہے۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہم عورتوں کو بہت بھاری پڑتی ہیں۔ تمہارا باپ زندہ ہوتا تو میں دیکھتی، کس طرح تم ایک اجنبی کو گھر اٹھا لاتی ہو۔ زخمی تھا تو تمہیں کیوں درد اٹھا۔ ہمدردی کرنے کے لیے اور بہت لوگ ہیں اس دنیا میں، اور جو وہ زخمی نہ ہوتا، ڈرامہ کر رہا ہوتا کوئی لٹیرا ہوتا تو پھر..... پھر جانتی ہو..... میرا جی تو چاہ رہا

ہے تمہارا منہ توڑ دوں۔ جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے ساری باتیں سنتی رہی اور پھر ان کے قریب سے گزر کر بالائی منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

بالائی منزل کے اکلوتے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ مقفل کیا اور بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں بند کر کے وہ اونیل جان کے نقوش کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''اس کی پیشانی کس قدر اجلی تھی۔ کسی فرشتے کی طرح۔ دائیں کنپٹی پر ایک سیاہ تل تھا، آنکھیں اتنی شفاف تھیں جیسے کانچ سے بنی ہوں۔ آنکھوں کا رنگ نہ جانے کیسا تھا۔ ہلکا بھورا یا شاید شربتی یا پھر سرخی مائل بھورا۔ نہ جانے کیا رنگ تھا، ایسی آنکھیں دنیا میں کسی اور کی ہوں گی؟..... نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ناک کا بانسا پیشانی سے پھننگ تک بالکل سیدھا، بھیگے بھیگے سے ہونٹ، اوپری ہونٹ ذرا سا اوپر اٹھا ہوا جو اسے بے نیاز ظاہر کرتا تھا۔ ٹھوڑی میں چھوٹا سا گڑھا تھا یا شاید نہیں تھا۔ لیکن محسوس ہوتا تھا۔

نجانے وہ کتنی دیر تک اس کے ایک ایک نقش کو ذہن میں دہراتی رہی۔ کبھی علیحدہ علیحدہ کبھی اجتماعی طور پر۔

''وہ دیوتا تھا، دیوتا جن کی عبادت کی جاتی ہے۔'' اسے آنکھ کے گوشے سے کان کی جانب پھسلتی نمی کا احساس ہوا، اس نے انگلیوں کی پوروں سے اپنے رخسار کو چھوا۔ اس کا چہرہ گیلا تھا۔

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے پہلو دکھنے لگے تھے۔ تمام رات چند ساعتوں کے لیے بھی اونیل کا چہرہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر خود کو ایسا کرنے پر مجبور پاتی تھی۔

صبح کالج کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ سخت عجلت کا شکار تھی۔ ناشتے کے نام پر اس نے دو گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارا اور بھاگم بھاگ گھر سے نکل آئی۔

امی رات والے واقعے کی وجہ سے اب تک ناراض تھیں سو انہوں نے بھی اس افراتفری کی وجہ دریافت نہیں کی۔

گھر سے نکل کر اس نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو اس چوراہے کی طرف جاتا تھا۔ جہاں سے وہ روزانہ ویگن پر بیٹھتی تھی۔ اس کے قدم اس سڑک کی طرف اٹھ رہے تھے جہاں رات کو اونیل ملا تھا۔ اس نے کئی بار خود کو باز رکھنا چاہا۔ واپس پلٹنے کی کوشش کی مگر کوئی تھا جو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اس کے پاؤں اس کے اختیار میں نہیں تھے۔ خاصی دیر تک نارے مارے پھرنے کے بعد اسے سڑک کے کنارے کھڑی ایک سیاہ کرولا نظر آ گئی۔ وہ اس جگہ سے قریب برگد کے فراخ تنے کی اوٹ میں اس طرح کھڑی ہو گئی کہ آنے جانے والوں کی نظروں سے محفوظ رہتے ہوئے سیاہ کرولا کو دیکھ سکے۔

جب اسے وہاں کھڑے کھڑے ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو تھک کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ کوئی بھی کار کو لینے کے لیے نہیں آیا۔ ساکت کھڑی گاڑی کے ٹائروں اور بندشیشوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ اس نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ کالج سے چھٹی کا وقت ہونے ہی والا تھا۔ اس نے اس بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ آنے والے سے اونیل کے بارے میں کیسے پوچھے گی۔ کس حیثیت سے سوال کرے گی۔

''ہو سکتا ہے، مکینک کے ساتھ وہ خود بھی آ جائے۔ پھر میں اس سے کیا کہوں گی۔ کیا میں اپنی موجودگی ظاہر کر سکوں گی۔ اسے بتا سکوں گی کہ میں صبح سے کس لیے یہاں بیٹھی ہوں۔ کیسے اس سڑک سے گزرنے والی تمام گاڑیوں کو حسرت بھری نظروں سے تکتی رہی ہوں۔ کیا میں یہ سب کہہ پاؤں گی؟''

اس کے پاس کسی سوال کا جواب تک نہیں تھا۔

''بے شک میں کچھ نہ بول سکوں، بھلے میں اس درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے نہ جا سکوں، مگر میں اسے ایک بار اور دیکھ تو لوں گی۔ اگر میں اسے دیکھ سکوں تو اس انتظار کا ذرا سا ملال بھی میرے دل میں باقی نہیں رہے گا۔ یہ ساری کوفت مٹ جائے گی۔ کاش وہ خود آ جائے..... کاش.....'' اسے گھر سے نکلے سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت سے بہت پہلے وہ کالج سے لوٹ آیا کرتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کا نچلا دھڑ اکڑ گیا تھا۔ کندھوں کے پٹھوں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کئی بار وہ واپس جانے کے ارادے سے اٹھی مگر چند قدم چل کر پھر وہیں آن بیٹھی۔

''کچھ دیر اور..... شاید اب کوئی آ جائے۔ یہ سفید گاڑی جو اس طرف آ رہی ہے شاید یہ

اس کالی کار کے قریب رک جائے۔ڈرائیور نے رفتار کچھ مدھم تو کی ہے شاید.....'' مگر کسی بھی گاڑی کے پہیے نہ تھمے۔

چار بجنے والے تھے۔وہ نم آنکھوں اور بے جان قدموں کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

امی اس کے انتظار میں دروازے کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔

''اتنی دیر.....شام ہونے والی ہے اور تم اب گھر آ رہی ہو۔اتنا وقت کہاں گزارا؟ میں تمہیں کالج پڑھنے کے لیے بھیجتی ہوں، آوارگی کے لیے نہیں۔میں ہزار بار منع کر چکی ہوں، اپنی سہیلیوں کے گھر مت جایا کرو۔''

وہ ہونٹ کچلتے ہوئے دھندلی آنکھوں سے زمین کو گھورتی رہی۔

''آئندہ اگر مجھے خبر ہوئی کہ تم کسی سہیلی کی طرف گئی ہو تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ کان کھول کر سن لو، تمہاری کوئی دوست تمہیں ملنے کے لے گھر نہ آئے اور نہ ہی فون کرے ورنہ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی، تمہارے سامنے اس کی بے عزتی کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی خیال نہیں آئے گا کہ تمہیں برا لگ رہا ہے۔اسکول کالج کی دوستیاں وہیں تک ہوتی ہیں۔چھٹی کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو آتے ہیں، دوسرو کے گھروں کو نہیں چل پڑتے منہ اٹھا کر۔ماں باپ بے چارے چاہے پریشانی سے مرجائیں، ذلیل اولاد کو کوئی دکھ ہی نہیں۔''

انہیں ہمیشہ ہی اس طرح بے تحاشہ غصہ آتا تھا۔

جاشیہ نے شولڈر بیگ وہیں فرش پر پٹخا اور تند آواز میں بولی۔

''آپ کو صرف تقریر کرنا آتی ہے۔ہمدردی کرنا نہیں آتا۔محبت کرنے، توجہ دینے کا ڈھنگ آپ کو بالکل معلوم نہیں۔آپ ٹیچر ہیں ناں، اسکول میں بھی تقریریں جھاڑتی ہیں۔گھر میں بھی لیکچر دیتی ہیں۔میں دیر سے آئی ہوں۔آپ نے ایک بار بھی یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ ایسا کیوں ہوا۔آپ نے گھر بیٹھے بیٹھے طے کر لیا کہ میں آوارہ ہوں۔آپ کا اندازہ تو غلط ہو ہی نہیں سکتا۔آپ تو غیب دان ہیں۔مجھ سے کبھی پوچھا آپ نے کہ ویگنوں میں دھکے کھاتے ہوئے میں کیسا محسوس کرتی ہوں۔جب دیر تک ویگن کے انتظار میں کھڑی رہتی ہوں، لوگوں کے فقرے، غلیظ اشارے برداشت کرتی ہوں تو مجھے کیسا لگتا ہے۔کوئی کندھے سے کندھا ٹکرا کر گزر

رہا ہے، کوئی چٹکی بھرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی آنکھوں سے نگلنا چاہتا ہے۔یہ سب بہت دلچسپ ہوتا ہے۔میں بہت محظوظ ہوتی ہوں۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''آپ نے مجھے دروازے سے اندر گھسنے نہیں دیا اور اعلان کر دیا کہ میں آوارہ ہوں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ اتنی دیر سے آئی ہو۔تمہیں پیاس لگ رہی ہوگی۔آپ نے پوچھا کہ صبح ناشتہ کیے بغیر چلی گئی تھیں، اب تک کچھ کھایا یا نہیں؟ تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو کھانا دے دوں، نہیں۔آپ کو یہ سب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔آپ کو تو گناہوں کا حساب لینے سے مطلب ہے، پولیس والوں کی طرح تفتیش کرنا جانتی ہیں آپ۔آپ نے کبھی میرے مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔آپ بہت بے حس ہیں۔''

وہ روتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔

عفت کچھ دیر گم صم سی وہیں پر جمی رہیں۔پھر آگے بڑھ کر اس کی بکھری ہوئی کتابیں سمیٹیں، بیگ پر لگی ہوئی گرد جھاڑی اور کتابیں اس کے اندر ڈال کر دروازے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئیں۔

جاشیہ نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا، دستک دینے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔عفت کھانا گرم کر کے اس کا انتظار کرتی رہیں مگر وہ نیچے نہیں اتری۔مغرب کی اذان کے وقت اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ تیز تیز سیڑھیاں اترتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''میں ایک پین خریدنے مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔آپ کو کچھ منگوانا ہے؟'' دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔اس کی متورم آنکھیں اور سرخ ناک بتا رہی تھی کہ وہ دیر تک روتی رہی ہے۔عفت کہنا چاہتی تھیں کہ باہر سرد ہوا چل رہی ہے۔گرم جرابیں اور جوگرز پہن کر جاؤ لیکن خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

جاشیہ پھر اسی جگہ جا رہی تھی جہاں وہ سیاہ کرولا موجود تھی۔فاصلہ تیزی سے طے کرنے کی خاطر وہ اس قدر تیز رفتاری سے چلتی رہی کہ وہاں پہنچنے پر اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اب وہ جگہ خالی تھی۔گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔

آسمان کے سینے سے پھوٹتا خنک اندھیرا اس کی رگوں میں اترنے لگا۔برگد کی خمیدہ

شاخیں چپکے چپکے ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں۔اس کی آنکھوں سے گرم پانی رسنے لگا۔

گھر تک جانے والا راستہ اسے کئی صدیوں کی مسافت لگ رہا تھا۔اس کے قدموں میں چلنے کی سکت باقی نہیں تھی۔اور عفت ٹی وی کی تاریک اسکرین کو گھورتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

''آج نہ جانے کیا ہوگیا؟ آٹھ بجے والا ڈرامہ تو وہ ہر قیمت پر دیکھا کرتی ہے۔آج خدا معلوم کیسے بھول گئی؟''

✠ ✠ ✠

بڑے سے سیاہ گیٹ پر بوگن ویلیا کی آتشی گلابی اور سفید کلیاں ایسے جھکی تھیں، جیسے کسی گھوڑے کی پیشانی پر گری ہوئی ایال، گیٹ پار کرتے ہوئے وہ کچھ متوحش سی تھی۔کسی ایسی ہرنی کی طرح جو باگھوں کے جتھے میں گھسنے پر مجبور ہو۔اندر داخل ہوتے ہی وہ نیم چھتی نظر آتی تھی جس کے نیچے چوکیدار کرسی بچھا کر بیٹھا تھا۔اس کے سامنے وسیع وعریض لان میں تقریباً ویسی ہی لڑکیاں ہرے، نیلے، گلابی اور زرد دوپٹوں کے ساتھ ادھر ادھر بکھری تھیں جیسی اس نے پہلے سے سوچ رکھی تھیں۔کالج اس کے تصور سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔عنابی اور کافوری رنگ میں ڈوبی عمارت یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔سفیدے کے دیوقامت درختوں کی دورویہ قطاروں میں سے گزر کر وہ ایڈمن بلاک کے قریب پہنچیں تو صدف ایک لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئی۔وہ ان دونوں سے بہت خوش اخلاقی سے ملی تھی۔اس کے نیلے دوپٹے سے عائشہ جان گئی تھی کہ وہ فورتھ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔

''لو جی۔سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا، عائشہ! یہ میری ہیں۔یہ تمہیں ٹائم ٹیبل اور کلاس رومز کے بارے میں سمجھا دیں گی۔''

''ان کا نام عائشہ ہے؟'' میری اس کا ہاتھ تھام کر ملائمت سے بولی۔

''کہاں سے آئی ہیں یہ؟''

''کنگن پور سے، اچھا باقی باتیں آپ اسی سے پوچھ لیں۔میں تو جا رہی ہوں۔ہسٹری کا پیریڈ نکل جائے گا ورنہ، عائشہ تم فولنگ سے بچنا چاہتی ہو تو ان کے ساتھ ہی رہنا۔نئی آنے والی لڑکیوں اور خاص طور پر تم جیسی لڑکیوں کی بہت گت بنتی ہے یہاں۔''

صدف چلی گئی اور میری اسے ساتھ لے کر لان میں سے ہوتی ہوئی اندرونی عمارت میں آ گئی۔نوٹس بورڈ کے سامنے ٹھہر کر اس نے عائشہ کی کلاسز کا شیڈول نقل کیا اور ساتھ ہی اس کے

متعلق سوال کرتی رہی۔ پھر وہ اسے سارے کالج میں گھمانے لگی۔ کلاس رومز دکھائے، کمپیوٹر لیب، لائبریری اور کینٹین دکھائی۔ اس دورانیے میں وہ عائشہ کے متعلق چیدہ چیدہ باتیں جان چکی تھی۔ مگر اپنے بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا تھا سوائے اس کے کہ وہ میری ہے اور ہوسٹل میں رہتی ہے۔

عائشہ کو پہلی ہی ملاقات میں وہ بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی آواز میں طنز یا ترحم کے بجائے نرمی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت میں سرخی کی واضح جھلک تھی۔ ہنستے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے بھنور پڑتے اور سفید چمک دار دانتوں کی سیدھی قطار آنکھوں میں کھبنے لگتی۔ کٹورا سی آنکھوں میں نمی سی ہلکورے لیتی تھی، گھنے سیاہ بال کندھوں سے ذرا نیچے تک جھول رہے تھے۔ میری میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو حسین ہونے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس کی اچھی صورت اور نرم خوئی کے علاوہ عائشہ اس لیے بھی خوش تھی کہ اس کی معیت میں وہ اس خوف سے کسی حد تک پیچھا چھڑا چکی تھی جو کالج کے حوالے سے اس کے اعصاب پر سوار تھا۔

''صدف نے کہا تھا یہاں مسجد بھی ہے کالج میں۔ مجھے وہ دکھا دیں۔''

اس نے میری کے ساتھ چلتے ہوئے کہا تھا۔

''مسجد بھی دکھا دیتی ہوں۔ وہ اس طرف ہے۔''

اس نے ایک سمت اشارہ کیا اور قدموں کو اسی رخ موڑ دیا۔

''تم نماز پڑھتی ہو؟''

''جی ہاں.....''

''یہ ہے مسجد۔ اندر سے دیکھنی ہے تو آ جاؤ۔''

مسجد کے مقابل شہتوت کے تین درخت ایک قطار میں ایستادہ تھے۔ وہ ان کے سایے میں ٹھہر گئیں۔ بہت سی لڑکیاں مسجد میں آ جا رہی تھیں۔

''یہ لڑکیاں اس وقت مسجد میں کیا کر رہی ہیں؟ نماز کا وقت تو نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا تو میری ہنس پڑی۔

''مسجد میں واش بیسن کے اوپر آئینہ لگا ہے۔ لڑکیاں وہاں اپنا میک اپ درست کرتی ہیں۔ بال بناتی ہیں۔ نماز پڑھنے تو کوئی ایک آدھ ہی جاتی ہے۔''

''آپ کرسچن ہیں جی؟''

عائشہ نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کافی دیر سے اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔ نام سے میری مسلمان نہیں لگتی تھی۔ وہ شروع سے ہی اس بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی مگر جھجک مانع تھی۔

میری یکدم چپ سی ہو گئی۔ کئی ثانیے وہ خاموش رہی اور پھر خلا میں گھورتے ہوئے آہستگی سے سر ہلایا۔

''ہاں۔ میں کرسچن ہوں۔''

عائشہ کو اس کی خاموشی بڑی عجیب لگی تھی۔

✠ ✠ ✠

سامنے فٹ پاتھ پر تیز تیز ڈگ بھرتے شخص کی ایک جھلک دیکھ کر وہ چونک پڑی تھی۔ شاید وہ وہی تھا۔ وہ ایک ساعت کے لیے تذبذب کا شکار ہوئی لیکن اس کے پاس یہ فیصلہ کرنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ واقعی اونیل جان تھا یا نہیں۔ وہ آدمی چند لمحوں میں اس کی نظر سے اوجھل ہونے والا تھا۔

کھڑکی سے ہٹ کر وہ سرپٹ سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ جس رفتار سے اس نے سیڑھیاں طے کی تھیں، نہ جانے وہ کیسے گرنے اور چوٹ کھانے سے محفوظ رہی تھی۔ گھر کے عقب میں سڑک پر پہنچتے ہی وہ اس سمت بھاگنے لگی تھی جدھر وہ جاتا دکھائی دیا تھا۔

اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ اسے روکنے میں کامیاب ہو گئی اور وہ اونیل ہوا تو اس سے کیا کہے گی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بنا ہی اس تک پہنچنے کی سعی کر رہی تھی۔

نہ جانے وہ کب تک بھاگتی رہی تھی، اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ یک لخت وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک راہ گیر سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ وہ گھر سے کافی دور پرہجوم سڑک پر نکل آئی تھی۔ خالی الذہنی میں وہ کچھ دیر ساکت کھڑی رہی۔ پھر اسے احساس ہوا تھا کہ اردگرد بہت سے لوگ اسے عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی۔ تیزی سے بھاگنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کی نگاہ بھٹک کر اپنے پیروں کی جانب گئی تھی۔ خود فراموشی میں وہ ننگے پاؤں گھر سے نکل آئی تھی۔ اپنی کڈھب حالت کو محسوس کر کے وہ

خجالت سے سر جھکائے واپس مڑی۔

''کیا میں کبھی اسے دیکھ نہیں پاؤں گی؟''

اس کی آنکھیں اس تکلیف دہ سوچ سے پانی تلے ڈوبنے لگیں۔

گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اسے قریب سے گزرتا ہوا نوں کا گروہ نظر آیا تھا۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔

''میں سنڈے کو ضرور چرچ جاؤں گی۔ وہ یقیناً وہاں مل جائے گا۔''

اگلے ہی پل وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

''اور نہ ملا تو میں ہر سنڈے کو چرچ جایا کروں گی۔ اس شہر کے سارے گرجا گھروں میں اسے ڈھونڈوں گی۔''

ہتھیلی کی پشت سے گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

اوائل جنوری کی برف کی ادھ گھلی قاش جیسی صبح تھی۔ کچھ کچھ جمی ہوئی اور قدرے پگھلی ہوئی سی۔ دودھیا سپید دھند کی ردا اوڑھے سرما کی ہوا، سکھ چین اور املتاس کے درختوں میں سے سکڑ سمٹ کر ٹھٹھری ہوئی رفتار سے بہہ رہی تھی۔

سیاہ تارکول کی سڑک پر بے چین، تیز قدموں سے چلتے ہوئے اوس میں بھیگے، خزاں گزیدہ، زرد، گیلے سیلے پتے اس کے پیروں سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ اس نے سرکتی ہوئی ادنی شال کو گردن اور شانوں کے گرد سختی سے لپیٹا اور دھند کے سفید، بے مہر سمندر میں منزل سے اپنے فاصلے کا تعین کرنے کی کوشش کی۔

گرجے کی پیشانی پر ایستادہ صلیب کہر کی دبیز چادر میں ملفوف آسمان میں مدغم ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بہت قریب پہنچ چکی تھی مگر فاصلہ تھا کہ سمٹنے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس کے متحرک قدموں کی جنبش پہلے سے فزوں تر اور مزید اضطراب آمیز ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مسلسل کراس پر جمی تھیں جیسے اسے اندیشہ ہو کہ نظر کے ذرا سے سرکنے پر وہ کہیں کھو جائے گا۔ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جس قدر وہ آگے بڑھ رہی ہے، اسی قدر چرچ اس سے دور ہوتا چلا جا

رہا ہے۔ دھند میں لپٹی صلیب آگے ہی آگے سرکتی محسوس ہوتی تھی، جیسے وہ بھی اسی سمت میں سفر کر رہی ہو، جیسے اس کے قدم آگے لے جانے کے بجائے اسے عقبی سمت میں دھکیل رہے ہوں۔ اس وحشت انگیز خیال سے اس نے اپنی رفتار استطاعت کی آخری حد تک تیز کر دی۔ وہ خاصی دور سے پیدل چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ یاسیت سے معمور موسم کی تلخ خنکی اور تھکن نے اعصاب کو اتنا بوجھل کر دیا تھا کہ قدموں سے چلنے کی سکت چھننے لگی تھی۔

جب اس کے پیروں نے گرجے کی یخ گرفتہ، نیم خوابیدہ سیڑھیوں کو چھو کر محسوس کیا تو وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ شدید ٹھنڈ کے باوجود اس کی ناک کی پھننگ اور اوپری ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں لرز رہی تھیں۔ گرم شال، جو کندھوں سے ڈھلک کر زمین پر گھسٹنے لگی تھی، اس کے پیروں میں الجھی تو اگلے زینے کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زوردار ٹھوکر لگی لیکن ایک لمحہ توقف کیے بغیر دو دو زینے پھلانگتی وہ چرچ کے صحن میں آ گئی۔

اندر صبح کی سروس جاری تھی۔ خراب موسم کے باعث بہت کم لوگ آئے تھے۔ پارکنگ میں کھڑی چند کاروں پر نگاہ دوڑا کر اسے مایوسی کا سامنا ہوا۔ وہ سیاہ کرولا ان گاڑیوں میں موجود نہیں تھی۔

وہ ایک سنگی بینچ پر ڈھے گئی جو مرکزی دروازے سے ذرا ہٹ کر پیپل کے درخت کے پاس نصب تھا۔

یہ ان کے گھر سے نزدیک ترین چرچ تھا۔ اس طرف کوئی بھی ویگن نہیں آتی تھی اس لیے اسے پیدل چل کر آنا پڑا تھا۔ رات کو امی کی چائے میں اس نے نیند کی دو گولیاں ملا دی تھیں۔ وہ سونے کے لیے کبھی کبھار سلیپنگ پلز لیا کرتی تھیں۔ ان کے رائٹنگ ٹیبل کی دراز سے وہ گولیاں حاصل کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا، وہ دن چڑھے تک سوتی رہیں گی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں ایک وقت میں صرف آدھی گولی استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی مگر بہرحال اسے دودھ والے کے آنے سے پہلے گھر پہنچنا تھا۔

سروس تمام ہو گئی تھی۔ لوگ باہر آنے لگے۔ لاشعوری طور پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

ایک خمیدہ کمر والے بوڑھے کے پیچھے اس نے اونیل کو نکلتے دیکھا تھا، اس کی آستین کے نیچے بینڈیج کا ابھار نظر آ رہا تھا، وہ سانس روک کر اس کے اٹھتے ہوئے قدم گننے لگی۔ وہ اس

کے بالکل پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ اس پر ایک چھلکتی نگاہ ڈال کر وہ گزر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل دی۔

اونیل کا رخ پارکنگ کی جانب نہیں تھا، وہ فٹ پاتھ پر مخالف سمت میں بڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر جاثیہ نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی خاطر چند گہری سانسیں لیں اور پسینے سے بھیگی ہتھیلیوں کو آپس میں جوڑتے ہوئے بولی۔

''ایکسکیوزمی...... آپ کو معلوم ہے اے بلاک......''

آواز سن کر وہ مڑا تھا۔

''آپ......؟ آپ اونیل ہیں ناں۔'' اس نے بہت کوشش کی مگر آواز کے ارتعاش پر قابو نہ پا سکی۔

''آپ......'' اس کی نظروں میں الجھن تھی۔ ''آپ تو وہی ہیں...... کیا نام تھا آپ کا؟''

وہ اسے پہچان گیا تھا۔

''جاثیہ......''

''ہاں جاثیہ بہت خوبصورت نام ہے۔ آپ یہاں کیسے؟''

''میری ایک کلاس فیلو یہاں رہتی ہے۔ اے بلاک میں چرچ کے سامنے گھر ہے اس کا۔ یہی بتایا تھا اس نے، میرے نوٹس اس کے پاس ہیں۔ ایک ہفتے سے وہ کالج نہیں آ رہی، ان کا فون بھی شاید خراب ہے۔ کل کے ٹیسٹ کے لیے مجھے اپنے نوٹس کی ضرورت تھی۔ آدھے گھنٹے سے تلاش کر رہی ہوں اس کا گھر...... آپ کے بازو کا زخم کیسا ہے؟'' چند لمحے پہلے سوچی ہوئی باتیں اس نے بغیر اٹکے دوہرا دیں۔

''اب تو خاصا بہتر ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے آپ سے اس طرح اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں اس جگہ سے قریب ہی ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''ٹھہرے ہوئے ہیں، کیا مطلب؟''

''میں یہاں نہیں رہتا، چند روز کے لیے آیا ہوں ایک کام کے سلسلے میں۔''

اسے سن کر دھچکا لگا۔ ''کاش وہ کام کبھی مکمل نہ ہو۔'' اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی تھی۔

''آپ کی گاڑی؟''

''بس ویسے ہی ذرا چہل قدمی کا موڈ ہو رہا تھا، اے بلاک چرچ کے پچھلی طرف ہے میرے خیال میں۔ ایک دفعہ وہاں سے گزرا تھا۔ صحیح طرح سے یاد نہیں۔''

اس کا مطلب تھا، وہ اب رخصت ہو جائے۔ جاثیہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اور کچھ کہنے کے لیے رہ بھی تو نہیں گیا تھا۔ وہ کتنی دیر اسے ٹھہرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

اونیل کے چہرے سے اکتاہٹ تو ظاہر نہیں ہوتی تھی تاہم اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''موقع ملا تو کبھی آؤں گا آپ کی طرف، آپ لوگوں نے میری بہت مدد کی۔''

بارش کے موٹے موٹے قطرے زمین پر گرنے لگے۔ اونیل نے ایک نظر آسمان کو دیکھا اور تیز آواز میں بولا۔

''چرچ کے اندر چلتے ہیں۔ آیئے۔''

اسے سردیوں کی بارش ناپسند تھی، مگر یہ بارش اسے اپنی زندگی کی سب سے اچھی بارش لگ رہی تھی۔

اونیل اوکاڑہ کا رہنے والا تھا، اس کے والد گزشتہ کئی برس سے مغربی جرمنی میں مقیم تھے۔ اونیل کی والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے وہیں شادی کر لی تھی۔ دوسری بیوی سے ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ اونیل اکیلا رہتا تھا، اس نے ہوٹل مینجمنٹ کے چند کورسز کر رکھے تھے۔ اوکاڑہ میں وہ ایک جدید طرز کا ریستوران تعمیر کروا رہا تھا۔ اور اسی سلسلے میں کچھ تجربہ کار لوگوں سے ملنے اور مشورہ کرنے یہاں آیا تھا۔ وہ کرائے کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرا ہوا تھا اور چند روز بعد واپس جانے والا تھا۔

بارش زیادہ تیز نہیں تھی۔ شاید دس یا پندرہ منٹ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی تھی۔ اور اس عرصہ میں اونیل اس سے یوں باتیں کرتا رہا تھا جیسے وہ برسوں سے ملتے آ رہے ہوں۔ بارش سے پہلے والی بیگانگی اور رسمی انداز کا شائبہ تک باقی نہ رہا تھا، وہ جاثیہ سے اس کی پڑھائی، فارغ اوقات کے مشاغل، عادات، پسند ناپسند کے بارے میں چھوٹے چھوٹے سوالات کرتا رہا اور جواب میں جو کچھ وہ بتاتی رہی، اسے بڑی دلچسپی سے سنتا رہا تھا۔ بارش رکنے کے بعد وہ چرچ کی پشت پر اے بلاک میں اس کے ساتھ وہ مکان ڈھونڈتا رہا جس کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔

سرخ کھپریلوں کی چھت والے مکان کے سامنے رک کر جاثیہ نے ایک طویل سانس بھری اور مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"آخر کار مل ہی گیا۔ یہی ہے اس کا گھر۔ اس نے کہا تھا کہ پورٹیکو کی چھت پر انگوروں کی بیل پھیلی ہوگی اور......اسے کچھ اور نہ سوجھا تو ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئی۔" بالکل ٹھیک پہنچ گئے ہیں۔"

"میں آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟ کل میں کالج کے گیٹ پر آپ کا انتظار کروں گا۔"

اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی بے ساختہ مسکراہٹ نے اونیل کو اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہ یوں گیٹ کے قریب کھڑی رہی جیسے اطلاعی گھنٹی بجا کر کسی ردعمل کی منتظر ہو۔ جونہی اونیل موڑ مڑ کر چرچ کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا، وہ بھاگتے ہوئے مکان کی بغلی گلی میں داخل ہوگئی۔

اس نے کبھی اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی جتنی وہ اس وقت کر رہی تھی۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تنفس تیز تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی، بارش کے بعد دھند چھٹ چکی تھی اور آسمان کی رنگت اجلی نیلی تھی۔ ایک وسیع نیلے کشکول جیسا آسمان اس قدر جھکا ہوا تھا کہ وہ چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر چھو لیتی۔ اس کے قدموں تلے بھیگی ہوئی سنگین روش کسی طلسم کے زیر اثر خود بخود سمٹتی جاتی تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی یا کسی انجانی سمت میں۔

وہ اپنے آپ میں مگن سر جھکائے چلی جا رہی تھی کہ ایک پھیلا ہوا مکروہ ہاتھ اس کے سامنے آ گیا۔ شاید وہ ہاتھ ہی تھا، کسی جانور کے پوست بریدہ پنجے جیسا ہاتھ، کلائی پر جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی، گلابی گڑھے جن کے کناروں پر سفید لیس دار مواد جمع تھا۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اس نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر گھناؤنا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس بھکاری عورت کا چہرہ اور گردن غلیظ رستے ہوئے پھوڑوں سے پر تھے۔ ایک آنکھ پر گلابی لوتھڑا اس طرح لٹکا تھا کہ وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دایاں کان یوں جھول رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے جسم سے جدا ہو کر گر جائے

گا، اس کے وجود سے ایسا ناقابل برداشت تعفن اٹھ رہا تھا کہ جاثیہ کو بے اختیار ابکائی آ گئی۔

اس نے پل اوور کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک سکہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی چٹکی میں پکڑ کر اس کی ہتھیلی کے اوپر ہوا میں ہی چھوڑ دیا۔ کراہت کے مارے اس کا سارا جسم سکڑا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، وہ چند لمحے اور یہاں ٹھہری تو اسے قے آ جائے گی۔

وہ تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی تھی کہ بڑھیا نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

وہ اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ سکہ اس نے زمین پر پٹخ دیا تھا۔

"تیں ماں سے گھن کھاوے کیوں ری تیں کوں گھن کیوں آوے۔ تیں وی کوڑھی اے ماں کی طرحیوں، پر تیں کا کوڑھ دکھے ناں، تیرو من کے بھیتر ماں کوڑھ اے" (تو مجھ سے، گھن کھاتی ہے، کیوں ری تو کیوں گھن کھاتی ہے۔ تو بھی کوڑھی ہے میری طرح، پر تیرا کوڑھ دکھائی نہیں دیتا۔ تیرے من کے اندر کوڑھ ہے)

جاثیہ خوفزدہ ہوگئی۔ بھکارن کی آواز میں وحشت تھی۔ شاید وہ کوئی پاگل تھی۔ وہ اس سے کترا کر بھاگ پڑی مگر کریہہ صورت بڑھیا اس سے زیادہ سرعت سے بھاگی اور ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ کولہا دبا کر چلتی تھی اور اس کی چال میں واضح لنگڑاہٹ تھی۔ اس کے باوجود وہ حیرت انگیز پھرتی سے جاثیہ کا راستہ روک چکی تھی۔

"میرو پنڈے کے جکھم تیں کوں نجر آویں۔ وا جو سونی چمڑی ماں لکائے پھریں، کوڑھ، تیں ان سے گھن کیوں ناں کھاوے۔ وس کوں سب دکھے۔ وا سب کے بھید جانے، بھیتر کی باتاں جانے، وا تیں سے گھن کھا گیا تاں بول ری۔ کیا کرے گی۔ تیں کدھر جاوے گی۔ بول ری تیں کیا کرے گی۔" (میرے بدن کے زخم تجھے نظر آتے ہیں۔ وہ جو خوبصورت چمڑی تلے کوڑھ چھپائے پھرتے ہیں، ان سے تو گھن کیوں نہیں کھاتی۔ اسے سب دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کے بھید جانتا ہے اندر کی باتیں جانتا ہے۔ وہ تجھ سے گھن کھا گیا تو بول ری کیا کرے گی تو، کدھر جائے گی۔ بول ری تو کیا کرے گی؟)

پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی۔ جاثیہ پر بوکھلاہٹ طاری ہو چکی تھی۔ وہ مڑ کر پچھلی سمت میں سرپٹ دوڑنے لگی۔ اس بار فقیرنی نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر اس نے ایک

نظر مڑ کر پیچھے دیکھا، وہ اسی جگہ کھڑی سر اٹھائے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ جاثیہ نے اپنے دل کو کنپٹیوں میں بجتے ہوئے سنا تھا۔

✠ ✠ ✠

''تم اتنا کم کیوں بولتی ہو عائشہ؟''

''پتہ نہیں جی، میرے ابا جی کہتے ہیں، زیادہ بولنے والے بیوقوف ہوتے ہیں۔''

میری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اس کا مطلب ہوا، میں بے وقوف ہوں۔''

''نہیں جی۔'' اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو میں نہیں کہہ رہی، آپ زیادہ تو نہیں بولتیں۔ ضرورت کی بات ہی کرتی ہیں۔''

اس وقت وہ دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتے ہوئے اس خشک نالے کے کنارے بیٹھی تھیں جو پتوں سے اٹا پڑا تھا۔ نالے پر سایہ فگن درختوں کے باعث یہاں نسبتاً ٹھنڈک رہتی تھی۔ اور بہت سی لڑکیاں اپنے فارغ وقت میں ادھر ڈیرا جما لیتیں۔

شور کی آواز سن کر عائشہ کی توجہ اس جانب منعطف ہوئی تو اس نے ایک دبلی پتلی لڑکی کو کتے کا پلا اٹھائے ہوئے دیکھا۔ نالے کا کچھ حصہ جو کنکریٹ کی سلوں سے ڈھکا ہوا تھا وہاں کتیا نے بچے دے دیئے تھے۔ اس نے پہلے بھی لڑکیوں کو کتیا اور اس کے بچوں پر پتھر برساتے دیکھا تھا۔

وہ لڑکی پلے کو اگلے پنجوں سے لٹکا کر دائیں بائیں جھلاتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ اس کے اردگرد چھ سات لڑکیوں کا گروہ گھیرا ڈالے اس کھیل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پلا اس آفت سے گھبرا کر چیاؤں چیاؤں کر رہا تھا۔

میری نے عائشہ کے چہرے پر پھیلتا اضطراب بھانپ کر وجہ پوچھی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ بولے بنا اسی سمت دیکھتی رہی۔ اب وہ لڑکی اس مختصر حوض کی جانب جا رہی تھی۔ جس میں ایک بڑے نل سے گرتا ہوا پانی جمع ہوتا تھا۔ لڑکیاں وہاں پر منہ ہاتھ دھوتی تھیں۔ حوض کے قریب جا کر اس نے پلے کو زور سے جھلایا اور حوض میں اچھال دیا۔

ایک لڑکی نے تاک کر پتھر دے مارا۔ وہ درد سے بلبلا کر زور زور سے چلانے لگا۔ ایک

من چلی لمبی سی چھڑی اس کی کمر میں چاقو کی طرح گھونپ کر اسے غوطہ دینے لگی۔

عائشہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی سے ان لڑکیوں کے قریب چلی گئی۔ میری بھی اس کی تقلید میں اٹھ گئی تھی۔

وہ لڑکیوں کا گھیرا توڑ کر آگے بڑھی اور باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے پلے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

''کیا کر رہی ہو عائشہ! چھوڑو اسے۔'' میری کو اس کی بے وقوفی پر غصہ آ گیا۔ آس پاس کھڑی لڑکیاں اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

''ناں جی، بے زبان جانوروں کو نہیں ستانا چاہیے۔'' وہ بڑے اطمینان سے بھیگے ہوئے پلے کو اپنے دوپٹے سے پونچھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر لڑکیوں کے چہروں پر کھدا ہوا تمسخر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ پلا اپنے جسم کو بار بار سکیڑ کر پانی کے قطرے جھاڑ رہا تھا۔ اور اس کے بالوں سے اڑتے چھینٹے عائشہ کے کپڑوں اور شاید چہرے پر بھی گر رہے تھے۔ میری نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی رہی تھی۔ عائشہ نے پلے کا جسم اچھی طرح خشک کرنے کے بعد اسے دھوپ میں چھوڑ دیا۔ نل سے اپنا چہرہ، ہاتھ اور دوپٹے کا پلو دھویا اور مڑ کر یوں مسکرائی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں سے عجیب اطمینان جھلک رہا تھا۔

''تم نماز کیسے پڑھو گی؟ تمہارے کپڑے تو ناپاک ہو گئے۔''

''کوئی بات نہیں، میں قضا نماز پڑھ لوں گی۔''

''تمہارا دل نہیں گھبرایا اسے ہاتھ لگاتے ہوئے۔ اس کے جسم سے گندے چھینٹے اڑ رہے تھے؟''

''دل گھبرانے والی کیا بات تھی۔ یہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں۔ انہیں بھی درد ہوتا ہے۔ یہ بھی دکھی ہوتے ہیں۔ مخلوق کے ساتھ نیکی کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے جی۔'' عائشہ سادگی سے بولی۔

''تم نے اللہ کو خوش کیا ہے عائشہ..... اس کے بدلے میں وہ تمہیں کیا دے گا؟'' میری جانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''وہ نیکیاں دیکھ کر تھوڑی دیتا ہے، وہ تو ان کو بھی دیتا ہے جو اس کا نام تک نہیں لیتے اور

ایسوں کو بھی جو ساری عمر کسی کا بھلا نہیں سوچتے۔ وہ اگر نیکیوں کے حساب سے تول کر دینے لگ پڑتا تو کسی کو کچھ بھی نہ ملتا۔ مخلوق بھلا خالق کو کیسے کچھ لوٹا سکتی ہے۔ اس نے ہاتھ پاؤں، آنکھیں، جسم کے سارے عضو دیے ہیں۔ یہ کوئی ہماری نیکیوں کا اجر تو نہیں ہے۔ دن میں کتنی بار سانس لیتے ہیں ہم۔ اگر ایک نیکی کے بدلے ایک سانس ہو تو بتائیں ہم کیسے پورے اترتے۔"

میری چند لمحے اس کے پرسکون چہرے پر نظریں جمائے رہی تھی۔

"ایک بات بتاؤ عائشہ! تم ان کپڑوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھ سکتیں۔ تمہارے کپڑوں پر لگی تھوڑی سی گندگی کے باعث وہ تمہاری نماز کیوں ٹھکرا دے گا۔ تمہاری نیت تو صاف ہے ناں۔ تمہارے دل میں تو اس کی محبت ہے، تم نے اس کی خاطر اپنے ہاتھ اور کپڑے گندے کر لیے، اور وہ معمولی سی غلاظت برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ کچھ عجیب سا نہیں لگتا۔"

عائشہ بینچ پر بیٹھتے ہوئے سابقہ دھیمے پن سے بولی۔

"ہم بندوں سے ملیں تو اچھے کپڑے پہنیں، بنیں سنوریں۔ جسم پر خوشبوئیں چھڑکیں۔ اچھا نظر آنے کے لیے پورا زور لگا دیں۔ اور اللہ سے ملیں تو کپڑے صاف بھی نہ ہوں، یہ زیادہ عجیب بات ہے جی۔"

"چلو اٹھو۔ میرے ساتھ ہوسٹل چلو۔" میری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دوپٹہ سارا گیلا ہو گیا ہے۔ میڈم زینت ضرور تم سے پوچھیں گی۔ پیریڈ شروع ہونے میں بس پانچ منٹ باقی ہیں۔ اس وقت تک تو یہ سوکھنے سے رہا۔ میں تمہیں اپنا پرانا دوپٹہ نکال دیتی ہوں۔"

ہوسٹل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں عائشہ کی ایک کلاس فیلو نے انہیں بتایا کہ میڈم زینت کسی ضروری کام سے چلی گئی ہیں۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آرام سے کمرے میں بیٹھیں گے۔"

"آپ اتنے پیریڈ کیوں چھوڑ دیتی ہیں؟" عائشہ نے گزشتہ پانچ چھ روز میں اکثر اسے کلاسز بنک کرتے دیکھا تھا۔

"اب کون اتنا سر کھپائے، پڑھائی میں کس کا دل لگتا ہے۔ بس مجبوری کے مارے بندھے بیٹھے ہیں۔ گریجویشن کی ڈگری ملنے کی امید پر۔"

"آپ ہوسٹل میں کیوں رہتی ہیں؟ آپ نے بتایا تھا ناں کہ آپ کے رشتہ دار ادھر کینٹ میں رہتے ہیں۔ وہاں سے تو آپ روزانہ آ جا سکتی ہیں۔"

"ہاں۔ رشتے دار تو ہیں، مگر دور کے۔ وہاں رہنے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ قریبی رشتے داروں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا، وہ تو پھر دور کے ہیں۔"

"ہاں جی۔ یہ تو ہے۔" عائشہ نے دھیرے سے سر ہلایا۔

میری کے کمرے کی آرائش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار ستائش آ گئی تھی۔ ہر ایک شے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ فرش پر ملائم ریشوں والا دبیز قالین، دیواروں پر ٹنگی پینٹنگز، قیمتی ڈیکوریشن پیسز، کھڑکیوں اور دروازے پر ریشمی پردے۔ دوپٹہ نکالنے کے لیے اس نے الماری کھولی تو خوش رنگ، دیدہ زیب ملبوسات کا ایک ڈھیر عائشہ کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ وہ کالج کی طالبہ کا کمرہ کسی طور نہیں لگتا تھا۔

گزشتہ روز باتوں کے دوران میری کے والدین کا تذکرہ چھڑ گیا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کے والد اسپیئر پارٹس کی دکان چلاتے تھے۔ اور وہ لوگ کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ والدین کی وفات پر ملنے والی انشورنس کی رقم کو قومی بچت کی ماہانہ منافع کی اسکیم میں انویسٹ کر کے اپنے اخراجات پورے کر رہی تھی۔ مگر اس کا کمرہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے، میری کے رشتے دار یتیم لڑکی سمجھ کر اس کی مالی مدد کر دیتے ہوں۔" عائشہ نے خود ہی اپنے دل کو مطمئن کر لیا۔ تجسس اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔

چھٹی کے وقت وہ عائشہ کو چھوڑنے کے لیے گیٹ تک آئی تھی۔ اور کالی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے دراز قامت شخص کو دیکھ کر اس کی قریب چلی گئی تھی۔

"عائشہ! ادھر آؤ۔ ان سے ملو، میرے کزن ہیں اونیل۔"

وہ نہ آگے بڑھی اور نہ ہی اونیل کی ہیلو کا جواب دیا۔ وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تمہاری کوئی نئی دوست ہیں نا؟"

"میں نے بتایا تو تھا تمہیں۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے عائشہ کو یہاں ایڈمیشن لیے ہوئے۔"

''اونیل! ہمیں آئس کریم کھلا لاؤ۔ میں ابھی جوتا چینج کر کے آتی ہوں۔ عائشہ! تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آئی۔'' وہ اپنے کمرے سے سلیپر پہن کر نکل آئی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم جوتا چینج کر آؤ۔ اتنی دیر میں میں تمہاری دوست سے اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔ تم نے تو دو جملے بول کر قصہ ختم کر دیا ہے، اونیل اور کزن ہونے کے علاوہ مجھ میں اور بھی کافی خوبیاں ہیں۔''

عائشہ نے اس کی آنکھوں کو خود پر جمے ہوئے پایا۔

میری اس کی رائے لیے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ اونیل چند قدم اٹھا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھل ہی رہے تھے کہ وہ تیزی سے مڑی اور گیٹ سے اندر چلی گئی۔ اسے اونیل کی شخصیت سے عجیب قسم کا خوف محسوس ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک مخصوص چبھن تھی۔ جو زرد چیونٹیوں کی مانند بدن پر رینگتی تھی۔

✠ ✠ ✠

چھٹی کے وقت وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو اونیل اس کے انتظار میں موجود تھا۔ جاشیہ کے لیے اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ بنا جھجکے بیٹھ گئی۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ زیادہ وقت اپنے ریسٹورنٹ کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اور جاشیہ اس کی اجلی پیشانی پر کروٹیں لیتے سیاہ بالوں، لودیتی آنکھوں، ہلتے ہوئے ہونٹوں کو مبہوت سی تکتی رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اونیل قطعی اجنبی تھا اسے اس پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ آنکھیں بند کر کے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے مگر وہ اس کو مسحور کر دیتا تھا جیسے کوئی سیاہ ناگ اپنی فسوں کار آنکھوں سے شکار کو بے حس و حرکت بنا دیتا ہے۔ شکار یہ جاننے کے باوجود کہ موت سے آنکھیں چار ہیں، پلکیں جھپکائے بنا ساکت و صامت رہتا ہے۔

اونیل کو سامنے دیکھ کر اس کے اندر کی مزاحمت دم توڑ دیتی تھی۔ وہ اس پر اعتبار کرنے پر مجبور تھی۔

اس نے گاڑی ایک مشہور چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی تھی۔ باوردی دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ کبھی اتنے مہنگے ریسٹورنٹ میں نہیں آئی تھی۔ رنگ و بو میں لت پت نامانوس ماحول نے اس پر خفیف سی گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔ ویٹر نے مینو کارڈ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کارڈ کھول کر فہرست پر نظر دوڑانے لگی۔ اسے چائنیز کھانوں سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں تھی۔ ایک ٹی وی پروگرام میں ایک آدھ چائنیز کھانے کا نام سن چکی تھی، اور انہی کھانوں کو وہ فہرست میں تلاش کر رہی تھی۔ بہت سوچ سوچ کر اس نے چکن منچورین اور فرائیڈ رائس کا انتخاب کیا۔ اونیل نے اس کی پسند کو ترجیح دی تھی۔ آرڈر میں اس نے محض ایک سوپ کا اضافہ کیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ مسلسل محسوس کرتی رہی کہ ان کے دائیں طرف والی میز پر براجمان چار لڑکیاں بار بار ان کی جانب دیکھتیں اور سر جھکا کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتیں۔ ان کی آنکھوں میں رشک اور حسد کے جذبات دیکھ کر جاشیہ کی گردن میں خود بخود تناؤ آ گیا۔ ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اونیل کے قدموں سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اسے گھر سے قدرے فاصلے پر اتارتے ہوئے اونیل نے کہا تھا۔

''میرا پروگرام دو تین روز میں واپس جانے کا تھا، مگر اب لگتا ہے، میں جلدی نہیں جا سکوں گا۔''

''کیوں؟'' وہ خوامخواہ انجان بنی۔

''بس اس شہر سے پیار ہو گیا ہے۔ جی ہی نہیں چاہتا اسے چھوڑ کر جانے کو۔''

وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکائی۔ ''پھر تو رہنا ہی پڑے گا۔ مجبوری ہے۔''

اگلے روز وہ پھر اسے لینے پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں نے ایک تفریحی پارک میں کچھ وقت گزارا۔ اور گزشتہ دن کی طرح اونیل اسے گھر کے قریب ایک کم آمد و رفت والی سڑک پر اتار کر رخصت ہو گیا۔

پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ روزانہ اسے کہیں گھمانے لے جاتا۔ زیادہ وقت گزر جانے پر جب جاشیہ واپس جانے کے لیے اصرار کرتی تو اونیل سخت کبیدہ خاطر ہوتا۔ دیر سے گھر آنے کا جواز پیش کرنے کی خاطر امی سے جھوٹ بولتے بولتے جب بہانے ناپید ہونے لگے تو اونیل نے اس مشکل کا یہ حل تجویز کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کالج جانا چھوڑ دے، اس طرح وہ زیادہ وقت اکٹھے بتا سکتے تھے۔

اونیل کی بات وہ کیسے رد کر سکتی تھی۔ خود اس کی بھی تو یہی مرضی تھی۔

وہ گھر سے کالج کے لیے تیار ہو کر نکلتی۔ چوراہے سے اگلے موڑ پر اونیل اس کا منتظر ہوتا۔ چھٹی کے وقت وہ اسے واپس چھوڑ دیتا۔ اس نے وقت پر گھر آنا شروع کر دیا تو امی بھی مطمئن ہو کر خاموش ہو گئیں۔

اسے معلوم تھا کہ اونیل صرف اس کی خاطر ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر آخر تو اسے لوٹ کر جانا تھا۔ اس کی واپسی کے بارے میں سوچ کر جاشیہ کی نبضیں تھمنے لگتیں۔ اس اذیت ناک وقت کا تصور بھی

اس کے لیے سوہان روح تھا۔ اس کی سوچ کا اختتام بس یہیں پر ہو جاتا تھا کہ اونیل اس کے پاس تھا، وہ اسے مل سکتی تھی، جی بھر کے دیکھ سکتی تھی، اس کی آواز سن سکتی تھی لیکن ایسا کب تک ممکن ہو گا؟ وہ چلا گیا تو کیا ہو گا؟ ان دونوں کے درمیان مذہب کی دیوار حائل تھی، اسے کس طرح عبور کیا جا سکتا تھا۔ امی کو اس کے چوری چھپے ایک عیسائی لڑکے سے ملنے کی خبر ہو گئی تو حالات کیا ہو جائیں گے؟ یہ سب وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

✠ ✠ ✠

''میں پروین کی طرف جا رہی ہوں۔ اس کی نند بہت بیمار ہے۔ کئی دنوں سے جانا چاہ رہی تھی لیکن یاد ہی نہیں رہتا کچھ۔ کینسر ہے بیچاری کو۔ آخری سانسیں لے رہی ہے۔ تم دروازہ بند کر لو۔ مجھے شاید ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔''

عفت نے گرم چادر اوڑھتے ہوئے اطلاع دی تھی۔ پروین اسکول میں ان کی کولیگ تھیں۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوئیاں نو بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس نے انہیں رخصت کر کے دروازہ بند کیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ویگن میں بیٹھ چکی ہوں گی تو وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر سڑک پر آئی اور دائیں بائیں دیکھ کر مارکیٹ کی طرف چل دی، ایک پی سی او سے اونیل کے موبائل پر فون کر کے اسے آنے کے لیے کہا۔ اور اسی پی سی او کے سامنے اس کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے پاس تھا۔ گاڑی کو مناسب جگہ پارک کر کے وہ دونوں ایک نسبتاً ویران سڑک پر چہل قدمی کرنے لگے۔

خنک خزاں رسیدہ رات کی دھندلی مانگ میں چاند سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ ہر شے پر دھند کی ہلکی سی تہہ تھی۔ اس نے چلتے چلتے اپنے سر پر سایہ فگن بلند و بالا سفیدے اور شیشم کے درختوں پر نگاہ دوڑائی۔ ہر سو خزاں کا حزن و ملال ٹھہرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کولتار کی سیاہ، اوس میں بھیگی سڑک پر جہاں تک اسٹریٹ لائٹس کی پیلی روشنی نظر کی انگلی تھام کر لے جاتی تھی۔ کناروں پر لگے درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے زرد پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ زرد پتے، زرد روشنی، زرد چاند ہر شے خزاں کے دائمی زرد رنگ میں نہائی ہوئی تھی۔

سرد ہوا کا جھونکا اس کے بدن سے ٹکرایا تو اس پر خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔

''اس بار سردی کچھ زیادہ نہیں۔''اس نے پل اوور کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑتے ہوئے خیالات میں مستغرق اونیل کو پکارا۔

''ہوں.....کیا کہا؟'' وہ ایک دم چونک کر متوجہ ہوا۔ پھر اس کے کہے ہوئے فقرے پر غور کرتے ہوئے بولا۔'' کچھ.....کچھ نہیں۔ خاصی زیادہ گزشتہ برس تو ان دنوں میں شام کی ہوا بہت خوشگوار ہوا کرتی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سے پیروں تلے آ کر چرمراتے پتوں کو تکنے لگا۔ وہ خلاف معمول متفکر اور خاموش تھا۔

''میں محسوس کر رہی ہوں، تم کچھ پریشان ہو۔''

''ہاں'' اس نے سر کو دھیرے سے جنبش دی تھی۔''میں پرسوں واپس جا رہا ہوں۔'' سفیدے کے درخت زمین بوس ہونے لگے۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ بہت دیر تک اس کے منہ سے ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہوا۔

''تم چلے جاؤ گے اونیل؟ جانا تو پڑتا ہے۔ جانا تو پڑے گا ہی.....ہمیشہ کے لیے کوئی کیسے اجنبی جگہ پر رک سکتا ہے۔''اس کی آواز میں نمی گھلنے لگی۔

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' اچانک اونیل نے قدم روک کر پوچھا۔

وہ چلتی رہی۔''تم مسلمان ہو سکتے ہو؟''

اونیل چپ رہا۔ وہ ایسی ہی خاموشی کی توقع کر رہی تھی۔ سفیدے کے دیو قامت درختوں کی پھننگوں پر پہلی تاریخوں کا ادھورا چاند اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس چاند میں روشنی کی ایک بوند نہیں تھی۔ سفید سنگ مرمر کا کوئی ٹکڑا درختوں کی شاخوں میں الجھتا ہوا کی ہتھیلی پر سوار اس کے سنگ محو سفر تھا۔ اپنے پہلو میں اسے اونیل کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی تھی۔

''جاشیہ''

وہ آگے بڑھتی رہی۔

''میں مسلم ہو جاؤں گا، میں تمہاری خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ بے یقینی سے اس نے مڑ کر اونیل کا چہرہ دیکھا جو اس لمحے جوش سے تمتمایا ہوا تھا۔

''اگر مسلم ہو جانے سے مجھے تم مل سکتی ہو تو مجھے ایسا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔''وہ

تیزی سے چلتا اس کے قریب آ گیا۔

اس نے نظر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ چند لمحے پہلے جو چاند روشنی سے یکسر محروم تھا اب اتنا چمک دار ہو گیا تھا کہ اس پر نظر ٹھہرانا مشکل تھا۔

''میں صرف اس لیے کرسچن ہوں کہ میرے والدین کرسچن ہیں۔ اور تم محض اس وجہ سے مسلم ہو کہ تمہارے بڑے اس مذہب کے پیروکار تھے۔ یہ سلسلہ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس چیز کو میں نے اپنی مرضی سے چنا ہی نہیں۔ اس کے لیے اپنی زندگی برباد کر دینے کی بے وقوفی کا متحمل کم از کم میں نہیں ہو سکتا۔''

اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ جس لمحے کے خوف سے اس کا دل سہم سہم کر دھڑکتا تھا، وہ اتنا سہل ہو گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''اس روز تمہیں چرچ کے سامنے دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ تم بہت مذہبی ہو گے مگر تم تو.....''

خوشی سے اس کی دھڑکن قابو سے باہر ہوئی جاتی تھی۔

''چرچ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ میں خود پر خوشیاں حرام کر لوں۔ جاشیہ! تم میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو اور میں کسی قیمت پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میری کمیونٹی مجھ سے قطع تعلق کر لے چاہے ساری دنیا مجھ سے روٹھ جائے، میں تم سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ مذہب ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔ ملا کیا سوچے گا اور پادری کیا کہے گا، ہمیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنے کی اس سے زیادہ ٹھوس وجہ کوئی نہیں ہو سکتی۔''

''میں اتنی خوش قسمت کیسے ہو سکتی ہوں؟'' وہ ہوا کے دوش پر تیرتی سوچ رہی تھی۔

''میں ابھی تمہارے ساتھ کسی بھی مسجد میں جا کر اسلام قبول کرنے پر تیار ہوں، لیکن کیا تمہاری امی رضامند ہو جائیں گی؟'' وہ چونک گئی۔

''امی.....امی تو شاید اس بارے میں سنتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں گی۔''

''اگر میرے مذہب تبدیل کرنے کے بعد بھی تمہاری امی اس شادی پر تیار نہ ہوئیں تو کیا کرو گی تم؟ انہیں ناراض کرنے کی ہمت ہے تم میں؟'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس کے لمس کی حدت کو اپنے شانے میں جذب ہوتے محسوس کرتی رہی اور پھر ٹھوس لہجے میں بولی۔

''ہاں، میں کسی بھی حد سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔''

✠ ✠ ✠

اونیل کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دے کر وہ انتظار کرنے لگی۔ آج وہ دس روز بعد اوکاڑہ سے واپس آیا تھا اور ان دس روز میں اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اونیل کے بغیر رہنا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کل رات کو اس نے فون کر کے اونیل سے بات کی تھی اور یہ جان کر کہ وہ اگلے روز واپس آ رہا تھا، ایک ایک پل گننے لگی تھی۔

اونیل نے کالج سے چھٹی کے وقت ملنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن وہ اس وقت تک انتظار کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ خود کو بہت سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ اونیل کے اپارٹمنٹ میں آنے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ آج سے پہلے کبھی اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں نہیں آئی تھی۔ اور دروازے کے سامنے پہنچ کر کسی قدر تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ لیکن اب تو وہ آ چکی تھی، دستک بھی دے چکی تھی۔ دروازے کے دوسری جانب قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

دروازہ کھلا اور اونیل نے بے تکلفی سے اسے ہاتھ سے تھام کر اندر کھینچ لیا۔ وہ اس اچانک حملے پر خود کو بر وقت سنبھال نہ سکی اور لڑکھڑا کر اس کے کشادہ سینے سے جا ٹکرائی۔

''اونیل......!'' وہ اس کی گرفت میں کسمسائی۔

''مجھے یقین نہیں آتا'' وہ خمار آلود لہجے میں بولتا اس پر جھکا۔ اس کی گرم سانسوں میں بسی تیز بو کے بھبکے نے جاثیہ کی تمام حسیات کو بیدار کر دیا تھا۔ وحشت زدہ ہوتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کرایا۔

''کیا ہوا......؟'' وہ اس کی گھبرائی ہوئی صورت پر نظریں گاڑ کر ہولے سے [illegible]ا۔ اور دروازے کو لاک کر دیا۔

اونیل کے چہرے کی غیر معمولی سرخی، چڑھی چڑھی آنکھیں اور قدموں کی لڑکھڑاہٹ

اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر دھری لمبی گردن والی سبز بوتل اور بلوریں جام کی تہہ میں تیرتے رنگین سیال کو دیکھ کر اس کے شکوک کی تصدیق ہو گئی۔

''اونیل شراب پیتا ہے۔'' اسے دکھ ہوا۔ ہونٹ کچلتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

''تم پریشان ہو گئی ہو جاثیہ؟ اطمینان سے بیٹھو۔ میں آؤٹ نہیں ہوں۔''

''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا'' وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی۔

''کچھ بولو نا۔ آئی سویئر میں زیادہ نہیں پیتا۔ تمہاری خاموشی مجھے گلٹی فیل کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ میں کیسے وقت گزارتا؟ دوپہر کا انتظار کرتے کرتے...... میں تو صرف اس اذیت ناک انتظار کی کوفت دور کرنے کے لیے......کم آن یار، گھبرانے کی کیا بات ہے۔''

اس کی آواز میں لہک تھی اور جملے بے ربط۔

''میں پریشان نہیں ہوں۔'' وہ فقط اسی قدر کہہ سکی۔

اونیل ذرا سا ڈول کر اٹھا اور اس کے پہلو کے ساتھ پہلو جوڑ کر بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے جاثیہ کے حواس مختل کر رہے تھے۔ وہ آہستگی سے پرے کھسک گئی۔

''تم اتنی خاموش کیوں ہو؟ میں نے کہا نا، میں سوبر ہوں۔''

اس نے جھنجھلا کر ہاتھ جھٹکا۔

''تمہارے آنے سے پہلے میں نے صرف دو سمال پیگز لیے تھے۔ میں نے تمہیں کتنا مس کیا، تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔''

''میں نے بھی۔'' جاثیہ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائیں۔

وہ اپنے دل میں اونیل کے لیے خفگی یا غصہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں وہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ اونیل کی آنکھوں میں تیرتی سرخی نے انہیں اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا۔

''چلو ٹیرس پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ آج بہت دنوں بعد بھرپور دھوپ نکلی ہے۔''

اونیل نے کندھوں سے تھام کر اسے صوفے سے اٹھایا۔ عمارت کے پچھواڑے گھاس کے میدان میں چوبی نشستوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ چمکیلی دھوپ مخملی سبز گھاس اور پتھریلی

روشوں کو نکھار رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے جاشیہ!''

ایک ٹنڈ منڈ پیڑ کو گھورتے ہوئے اونیل نے اسے مخاطب کیا۔

''شرابی خداوند کی بادشاہی میں داخل نہیں ہوسکتا۔ بائبل میں لکھا ہے۔ مجھے شراب بری لگتی ہے لیکن کبھی کبھار..... خداوند کی بادشاہی میں.....''

وہ زیر لبی میں بولنے لگا۔

''ہم ایسے کاموں سے کیوں نہیں رکتے جن سے روک دیا گیا ہے۔''

جاشیہ نے متعجب ہوکر اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں اپنا مذہب چھوڑنے پر دکھ ہوگا اونیل! کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اس فیصلے پر قائم رہ سکو گے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اونیل نے نظروں کا زاویہ تبدیل کر کے ایک جاندار مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی تھی۔

''مجھے صرف تمہیں چھوڑ کر دکھ ہوگا۔ تمہارے لیے جو کچھ بھی مجھے چھوڑنا پڑا، چھوڑ دوں گا۔ مذہب تو ایک پھندے کی طرح ہماری گردنوں میں کس دیا گیا ہے۔ جو تابعداری مذہب مانگتا ہے، وہ تو شاید سدھائے ہوئے جانور بھی نہ دکھا سکیں۔ تم نے کبھی سرکس دیکھا ہے؟ شیر ایک معمولی اور کمزور انسان کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے، وہ اس آدمی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ اس آدمی کے ہاتھ میں اگر الیکٹرک baton نہ ہو تو شیر ایک لمحے میں اسے چیر پھاڑ دیں۔ مذہب وہ الیکٹرک baton ہے اور مذہب کے ٹھیکیدار اسے ہر اس پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں..... چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔''

وہ اب سنبھلا ہوا لگ رہا تھا۔

''تم نے اپنی امی سے بات کی؟''

اس کا سر نفی میں ہلا۔ ''میں کرلوں گی۔ جلد ہی کرلوں گی۔''

اس نے گویا خود کو تسلی دی تھی۔

''میری سالگرہ ہے اس تھرسڈے کو۔ میکڈونلڈ میں سیلیبریٹ کریں یا پی سی میں؟''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''مجھے تو تمہاری مرضی عزیز ہے۔''

وہ مسکرا کر کسی انگلش گانے کی دھن پر سیٹی بجانے لگا تھا۔

''اونیل نے کم از کم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے شادی کے بعد مجھے اس بارے میں پتا چلتا تو شاید مجھے زیادہ دکھ ہوتا۔ وہ ڈور آئی سے مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ چاہتا تو شراب کی بوتل کہیں چھپا دیتا اور چاہتا تو دروازہ ہی نہ کھولتا۔ مجھے کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ بہت سے لوگ شراب پیتے ہیں لیکن ان سب میں اعتراف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اونیل کتنا مختلف ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کوئی بھی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھی۔''

وہ خود ہی اونیل کی وکالت کر رہی تھی۔ ویسے بھی اس کا ذہن اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

اس کا دھیان اونیل کی سالگرہ پر لگا تھا۔ کوئی اچھا سا تحفہ خریدنے کے لیے اسے خاصی رقم چاہیے تھی۔ امی جیب خرچ کے نام پر ہفتے میں ایک آدھ بار دس پندرہ روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ اتنے پیسوں میں سے کچھ بچانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی زیادہ تر سہیلیاں بھی اسی کی طرح لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سے بھی ادھار ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اونیل کو تحفہ دینے کے لیے وہ رقم کا بندوبست کہاں سے کرے گی۔ گھر آنے تک وہ خاصی متفکر ہو چکی تھی۔

✠ ✠ ✠

اس نے توے کے نیچے آنچ دھیمی کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ عجی کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔

''سویرے سویرے ہوٹل کی کالی چائے پی کر سارا اندر جل جاتا تھا۔ چل تیرے آنے کا کوئی فائدہ تو ہوا۔''

عجی ڈبل روٹیاں بنانے والی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ فجر کی اذانوں سے قبل گھر سے نکل جاتا اور کمپنی کے مقامی ڈپو جا کر ڈپو انچارج کی موجودگی میں گنتی کر کے مال گاڑی میں لوڈ کرواتا۔ تائی جان یا صدف کو اتنی جلدی جاگنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اسے ناشتہ کیے بغیر ہی

رخصت ہونا پڑتا تھا۔

عائشہ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اس کے ڈیوٹی جانے سے پہلے اٹھ جاتی تھی۔ سو اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے کی ذمہ داری اس نے اٹھالی تھی۔

''اسٹیشن ہیڈ کوارٹر گیا تھا میں تیرے ''پاس'' کا پتہ کرنے کے لیے۔'' وہ چوکی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''کسی فوجی افسر کی سفارش چاہیے، سول بندے کو ویسے نہیں بنا کے دیتے۔ گڈی (گاڑی) کا پاس۔ پہلے بھی صدف کے واسطے مجھے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ اس کپتان صاحب کی پوسٹنگ ہوگئی ہے۔ جس نے پہلے کام کروایا تھا۔''

''باقی تو کوئی تکلیف نہیں پر کالج سے بس اسٹاپ پہنچنا بڑا مشکل ہے، تانگہ کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ کئی بار سالم تانگہ کرنا پڑتا ہے۔ پندرہ بیس روپے مانگتے ہیں تانگے والے۔'' عائشہ نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

ایک دو روز صدف اس کی ساتھ پرائیویٹ بس پر گئی تھی مگر اب وہ اکیلی ہی آ جا رہی تھی۔

''پیسوں کی فکر نہ کیا کر۔ مجھ سے لے لیا کر، جتنی ضرورت ہو۔''

''نہیں پیسے ہیں میرے پاس۔''

''شرماتی کیوں ہے، میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔''

وہ دھوئیں سے جھلتی دیوار کو دیکھنے لگی۔

عجی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ جب وہ روٹی چنگیر میں رکھ رہی تھی۔ تو عجی نے ایک شاپر لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''پوچھے گی نہیں اس میں کیا ہے؟''

وہ خاموشی سے رکابی میں سالن نکالتی رہی۔

''او کچھ بولا بھی کر۔ ہر وقت چپ نہ رہا کر۔ سوٹ لایا ہوں تیرے لیے۔ بازار گیا تھا۔ پسند آ گیا تو خرید لیا۔ دکاندار سے بات کر لی تھی کہ اگر سوٹ کا رنگ یا ڈیزائن پسند نہ آیا تو تین چار دنوں میں بدلوالوں گا۔ دیکھ تو سہی، تجھے پسند بھی ہے یا نہیں۔''

اس کا ہاتھ شاپر کی طرف نہیں بڑھا۔ کھانا عجی کے سامنے چوکی پر رکھ کر وہ باہر جانے لگی

تھی کہ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

''تو سمجھتی کیا ہے خود کو؟'' اس کے لہجے میں طیش تھا۔

''تم یہ سوٹ میرے لیے کیوں لائے ہو؟''

''اچھی لگتی ہے تو مجھے اس لیے لایا ہوں۔ پر تجھ میں ہے کچھ نہیں۔ میں ہی آنکھ کا اندھا ہوں۔ اوئے تو ہے کیا شے۔ کیا ہے تجھ میں جس پر تو اتنا اکڑتی ہے۔ تیری آنکھوں میں یہ کالے سپنولیے کنڈلی مار کے نہ بیٹھے ہوتے تو میں.....'' اسے روتے دیکھ کر وہ خاموش ہوگیا۔

''بیڑا غرق ہو ان آنسوؤں کا، جو ہر دم بہنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

وہ سر جھکائے اس کے قریب سے گزرنے لگی مگر وہ مزید پھیل کر کھڑا ہوگیا۔

''جب تک چپ نہیں کرے گی۔ جانے نہیں دوں گا۔ چاہے سورج چڑھ آئے، ادھر ہی کھڑی رہے گی۔''

آنسو کچھ اور روانی سے اس کے گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔

''میری مت ماری گئی تھی جو تجھ سے پیار کی بات کر بیٹھا۔ خدا قسم وہ ہمسایوں کی مسرت مرتی ہے مجھ پر، ذرا جو چھت پر چلا جاؤں تو صبح سے شام تک کپڑے سکھاتے سکھاتے پاگل ہو جاتی ہے اور ایک تو ہے۔'' اس کی آواز کی کرختگی مفقود ہوگئی تھی۔

''مجھ سے ایسی باتیں.....'' وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

''چل نکل یہاں سے۔ جا کے نماز پڑھ، پاگل سارے جہان کی۔'' اس نے ایک طرف ہٹ کر رستہ دے دیا۔

''وہ سوٹ صدف.....''

''آگ لگا دے اسے۔'' وہ تلخی سے بڑبڑایا اور چوکی کو ٹھوکر مار کر چلا گیا۔

وہ چوکی پر بیٹھ کر اذان کا انتظار کرنے لگی اسے معلوم تھا کہ عجی سے اس کی شادی متوقع تھی۔ ان کی برادری میں غیروں میں رشتہ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اماں ابا اور تایا جی کے درمیان ایک طرح سے بات طے ہو چکی تھی۔ تائی جان کی مخالفت کا سامنا نہ ہوتا تو شاید اب تک منگنی بھی ہو چکی ہوتی۔

عجی سے شادی پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ میٹرک پاس تھا۔ شکل وصورت اچھی تھی۔ ملازمت بھی کر رہا تھا۔ وہ بالکل ان پڑھ ہوتا۔ بدصورت ہوتا تو بھی اسے اس رشتے سے انکار نہ ہوتا۔ اس نے کبھی اس نہج پر نہیں سوچا تھا کہ کسی سے شادی کرنے کے لیے اس سے محبت ہونا ضروری ہے۔ اسے اتنی محبتیں میسر تھیں کہ کسی اور محبت کی چاہ باقی نہیں تھی۔

کنویں کی تہہ میں اگنے والے پودے کو بارش کی آس نہیں ہوتی، وہ بھی ایسا ایک پودا تھی پریم جل سے تر اور یز۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ ایسی مکمل محبتوں کے گھیرے میں رہی تھی جن میں رخنہ نہیں تھا۔ کھوٹ نہیں تھا۔

ابا کی محبت جو وہ سر درد کا دم کرتے ہوئے پھونکوں میں بھر بھر کر پیشانی پر انڈیلتے۔ ابا سے دم کروانا اسے اتنا اچھا لگتا تھا کہ کئی بار وہ جھوٹ موٹ سر درد کا بہانا کر دیتی۔ ابا ماتھے کی جلد کو چٹکی میں بھر کر ذرا سا کھینچتے اور چھو چھو کرتے جاتے، وہ آنکھیں بند کر کے دعا کرتی کہ آج دم طویل ہو جائے۔ ابا پڑھتے ہوئے بار بار بھولیں۔

اماں کی محبت جو وہ دیسی گھی کے پراٹھوں، ساگ، بھات اور ترکاریوں میں گھول گھول کر نچھاور کرتیں۔ اماں کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں تھا۔ کئی بار جب بھنڈی کا سالن لیس دار بنتا یا بوٹیاں کچی رہ جاتیں۔ نمک مرچ کم یا زیادہ ہو جاتا اور ان میں سے کوئی منہ تھتھا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا تو اماں کہتیں۔

''اللہ کے کاموں میں کس کا دخل ہے۔ لون (نمک) ڈالتے میرا ہاتھ کانپ گیا۔'' یا کہتیں۔

''قصائی نے بڈھا بکرا ذبح کیا تو میرا کیا قصور.....'' یہ جملے وہ اتنی عاجزی سے بولتیں کہ مانے بنا چارہ نہ رہتا۔

کنیز کی محبت، آپا کی محبت.....اسے تو مرغی کے چوزوں اور سیوتی کے برف ایسے سپید پھولوں سے بھی محبت تھی۔

اور ان سب سے بڑھ کر اللہ کی محبت، جس کے سامنے سب محبتیں ہیچ تھیں۔ اذان کی آواز آنے لگتی تو وہ ایک ایک حرف غور سے سنتی۔ بلاووں کا جواب دیتی۔ اسے لگتا کہ اسے خاص طور پر بلایا جا رہا ہے۔ تفاخر سے اس کی چال میں اتراہٹ سی آ جاتی۔ روٹی کا ہر لقمہ توڑنے سے پہلے بسم

اللہ پڑھتی۔ اسے یوں بڑبڑاتے اور نہایت آہستگی سے روٹی کھاتے دیکھ کر اماں چڑ جاتیں۔

''اک روٹی کھانے میں تجھے ورے لنگ گئے۔ (سالوں بیت گئے) بڑی لجی (ست) ہے تو۔''

وہ مسکرائے جاتی، بسم اللہ پڑھے جاتی۔

اس محبت کے بعد اسے کسی اور محبت کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا دل مطمئن تھا، کوئی ہلچل نہیں تھی تو وہ کیوں غیر اہم اور بے حقیقت چیزوں کے پیچھے بھاگتی۔

اذان شروع ہو گئی تھی۔ اس نے روٹی دسترخوان میں لپیٹ کر ہاٹ پاٹ میں رکھی۔ سالن دیگچی میں ڈالا اور باہر نکلنے لگی تھی کہ صدف آ گئی۔

''عجی بھائی کھانا نہیں کھا کر گئے؟''

''نہیں.....''

''کیوں.....؟'' وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتی اس شاپر کی طرف بڑھی۔ جواب تک ویسے ہی فرش پر دھرا تھا۔ ایک لمحے کے لیے عائشہ کا دل زور سے دھڑکا۔

''یہ سوٹ وہ تمہارے لیے لائے ہیں؟ بڑی بات ہے بھئی۔ میرا یا امی کا خیال تو انہیں کبھی نہیں آیا۔'' اس کی آواز میں طنز کی آمیزش تھی۔

''کچن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا عجی بھائی غصے میں ہیں۔ کیا تم کو سوٹ پسند نہیں آیا۔ ڈیزائن تو بہت زبردست ہے۔'' وہ کپڑے کی تہیں کھول کر دیکھنے لگی۔

''یہ تم رکھ لو صدف! میں نے تو عجی سے نہیں کہا۔ وہ خود ہی.....'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے اپنی صفائی پیش کرے۔

''کیوں، میں کیوں رکھ لوں، تمہارے لیے لائے ہیں تو تم ہی پہنو۔''

''اچھا۔ میں تائی جان سے پوچھ لوں گی۔ شاید انہیں پسند آ جائے۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر مڑ گئی۔

''نماز کو دیر ہو رہی ہوگی۔ ہاں جی.....نمازیں اپنی جگہ.....'' چبھتی ہوئی آواز۔ تضحیک آمیز لہجہ۔

عائشہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پتہ نہیں وہ تائی جان سے کیا کہہ دے۔ سارا دن سوچ

سوچ کر وہ پریشان ہوتی رہی۔ اس جگہ بیٹھنے سے گریز کرتی رہی جہاں وہ موجود ہوتیں۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

شام کو میری اس سے ملنے کے لیے آ گئی۔

''آپ کو گھر کیسے ملا؟'' اس کی اچانک آمد پر وہ حیرت زدہ تھی۔

''صدف کی ایک کلاس فیلو سے معلوم کیا۔ میں ادھر کینٹ آئی ہوئی تھی۔ سوچا تم سے ملتی چلوں۔ اس روز تم بغیر بتائے کہاں چلی گئی تھیں۔ میں سارے کالج میں ڈھونڈتی پھری۔ اونیل کہہ رہا تھا، تم کو کوئی لڑکی بلا کر لے گئی تھی۔ کم از کم مجھے بتا کر تو جاتیں۔''

عائشہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''بس پاس بن گیا تمہارا؟''

''نہیں جی، ابھی تک تو کچھ نہیں ہو سکا۔''

وہ میری کے لیے شربت بنانے اٹھ گئی۔ شوکیس سے کانچ کے گلاس اور جگ نکالتے دیکھ کر تائی جان اس پر برس پڑیں۔

''سارے گھر میں یہ ایک ہی شیشے کا سیٹ سالم بچا ہے۔ صدف کی سسرال سے کوئی آ جائے تو گھڑی کی گھڑی سجاوٹ کے لیے رکھ دیتی ہوں۔ اسٹیل کے گلاسوں سے باورچی خانہ بھرا پڑا ہے۔ ان میں کون سے کیڑے پڑے ہیں یا شیشے کے گلاس میں شربت پلائے بنا تمہاری ناک نہیں رہتی؟ میں نے تو آج تک تمہارے گھر سے کانچ کے برتن میں کچھ کھا پی کر نہیں دیکھا۔ یہاں آ کر تم لوگوں کے نخرے ہی اور ہو جاتے ہیں۔''

ان کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ ساتھ والے کمرے میں موجود میری کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ صبح والی بات کا غصہ انہوں نے اس بہانے نکالا تھا، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ صدف ان سے ذکر نہ کرتی۔

وہ اسٹیل کے گلاس میں شربت ڈال کر شرمساری میری کے پاس آ گئی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی عائشہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ اس سے نظریں ملانے سے گریزاں تھی۔ مگر میری نے اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں دلایا کہ وہ تائی جان کی باتیں سن چکی تھی۔

✠ ✠ ✠

''یہاں دراز میں دو ہزار روپے رکھے تھے۔ وہ کہاں ہیں۔'' عفت پچھلے آدھے گھنٹے میں پورا گھر کھنگال چکی تھیں۔ وہ مسلسل کتاب پر نظریں جمائے خود کو محو ظاہر کرنے میں کوشاں تھی۔ عفت نے گھر کا ہر کونا کھدرا کھوج لیا تھا۔ کچن میں، باتھ روم میں، کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے۔ صوفوں کی گدیوں تلے۔ ٹی وی ٹرالی کی درازوں میں، ہر جگہ دیکھنے کے بعد وہ رائٹنگ ٹیبل کی درازوں سے ایک ایک چیز نکال کر باہر اچھالنے لگی تھیں۔ شاید تیسری یا چوتھی بار وہ ان درازوں کی تلاشی لے رہی تھیں۔

''یہیں رکھے تھے۔ اچھی طرح یاد ہے مجھے۔'' ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے، میری پریشانی کا۔'' اسے لاتعلق بیٹھے دیکھ کر وہ پھٹ پڑیں۔ ''اٹھو اور تلاش کرو۔ کہاں چلے گئے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

''روزانہ ہی کوئی نہ کوئی چیز آپ کہیں رکھ کر بھول جاتی ہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ ''آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہ کتاب مجھے دے دیں۔ میرا ٹیسٹ ہے کل۔''

''بھاڑ میں گیا تمہارا ٹیسٹ۔ کوئی آیا تو نہیں تھا میرے بعد۔ برابر والی آصفہ تو نہیں آئی تھی۔ پہلے بھی وہ پورا کٹلری سیٹ اٹھا کر لے گئی تھی بغیر بتائے۔''

''وہ تو نہیں آئیں ہاں.....'' اسے جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ ''پطرس آیا تھا کوڑا لینے کے لیے میں تو باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ شاید وہ یہاں آیا ہو۔''

''اس بدبخت کو اکیلا کیوں چھوڑا تم نے۔ لعنت ہو تمہاری عقل پر، پیسے یہاں ہوں تو مجھے ملیں بھی۔ دراز میں سب سے اوپر رکھے تھے۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ اس نے تلاشی نہ لی ہو۔ یا اللہ.....'' وہ کرسی پر ڈھے گئیں۔

''پروین کو پچھلے تین ماہ سے ٹال رہی ہوں میں۔ اب وہ بھلا مانے گی کہ پیسے چوری ہو گئے ہیں۔ نند اس کی ہاسپٹل میں پڑی ہے۔ اسے ان دنوں بہت زیادہ ضرورت ہے۔ کتنی مشکل سے میں نے.....'' وہ سن ہوتے ہوئے بازو کو دوسرے ہاتھ سے دبانے لگیں۔

جاشیہ خاموش کھڑی ان کی دھندلاتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی رہی تھی۔

''امی! میں انیلا کے گھر چلی جاؤں؟ میرے پاس جرنلزم کے نوٹس.....''

''دفع ہو جاؤ، جہنم میں جاؤ.....'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ چیخ پڑیں۔

مڑتے ہوئے اس نے انہیں پھر رائٹنگ ٹیبل کی دراز پر جھکتے دیکھا۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے جرسی کی آستین کو چھو کر نوٹوں کی موجودگی کا اطمینان کیا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک خوبصورت پیکنگ والا مردانہ کلون، ٹائی کف لنکس اور سرخ پھولوں کا بوکے خریدا۔ اس تمام خریداری میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہو گیا تھا۔

بازار سے وہ انیلا کے گھر چلی گئی تھی۔ انیلا کلاس کی واحد لڑکی تھی جسے اس نے اوینل کے متعلق بتا رکھا تھا۔ ساری چیزیں اس کے پاس رکھوا کر وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ انیلا کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ اس نے دس روپے روزانہ کی کمیٹی ڈال رکھی تھی اور یہ تحائف اسی کمیٹی کے پیسوں سے خریدے گئے تھے۔

انیلا کا گھر قدیم شہر میں ریلوے لائن کے قریب تھا۔ ریل کی پٹڑی سے ذرا فاصلے پر گندے پانی کا ایک چوڑا سا نالہ بل کھاتا ہوا آبادی کی طرف بڑھتا تھا۔ واپسی پر جب وہ ویگن اسٹاپ تک جانے کے لیے پلیا سے گزر رہی تھی تو بائیں ہاتھ نالے کے کنارے گھورے پہ بیٹھی وہی زشت رو بھکارن دکھائی دی۔ اس کی ادھڑے ہوئے گوشے والی خون رنگ آنکھوں کو خود پر جمے پا کر جاثیہ کی ٹانگیں یکبارگی لرز گئی تھیں۔ حتی الوسع تیزی سے وہ پلیا پار کر گئی۔ اپنے عقب میں اس کی چیخ سن کر وہ ٹھہرنے پر مجبور ہوئی۔ کوڑھ گزیدہ بڑھیا نالے کے کثیف پانی میں گری چلا رہی تھی۔

''ہے اللہ ماں گر گئیو.....نکال ماں کوں، ای جلمی تیں کوں جری، ترس نہ آوے نکال دے ماں کوں۔ (ہائے اللہ میں گر گئی۔ نکال مجھے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ نکال دے مجھے) وہ گندگی سے لتھڑے غلیظ ہاتھ کنارے کی بھربھری مٹی پر جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نالہ خاصا گہرا تھا۔ صرف اس کا چہرہ اور گردن کنارے سے اوپر تھی۔

''ری کوئی سونق سے ناں گرے۔ پیر پھسل جاوے۔ تیں گری تاں کون نکالے گا تیں کوں، وس نے ہتھ نہ پکڑا تاں بول ری کیسے نکلے گی۔ کون نکل سکے اے وس کے ہتھاں بگیر'' (ری کوئی شوق سے نہیں گرتا۔ پیر پھسل جاتا ہے۔ تو گری تو کون نکالے گا تجھے۔ اس نے ہاتھ نہ پکڑا تو بول ری کیسے نکلے گی، کون نکل سکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کے بغیر)

جاثیہ نے اس کے بھیانک چہرے کو سراسیمگی سے دیکھ کر منوں وزنی قدم آگے بڑھائے۔

''تیں سمجھے توت کی گلی ڈال ہووے۔ لچکے جاوے لچکے جاوے ٹوٹے ناں، بھل اے تیں کی بھل اے۔ ناں ری تیں۔ ککر کی سوکھی وی سوٹی۔ جری جیادہ وجن پڑے تاں تڑک جاوے۔'' (تو سمجھتی ہے تو شہتوت کی گیلی ڈالی ہے۔ لچکتی جائے گی، لچکتی جائے گی۔ ٹوٹے گی نہیں۔ بھول ہے تیری، بھول ہے۔ نہ ری تو کیکر کی سوکھی ہوئی شاخ ہے۔ ذرا زیادہ وزن پڑا تو تڑخ جائے گی۔) اس کی آواز جاثیہ کے تعاقب میں تھی۔

''کوڑھی اے کوڑھی.....'' بڑھیا نے مجنونانہ قہقہہ لگایا۔ ''ایں کوڑھی اے.....کوڑھی اے.....'' (یہ کوڑھی ہے.....کوڑھی ہے)

وہ پیچھے دیکھے بنا لرزیدہ قدموں سے آگے بڑھتی رہی۔ بڑھیا کی سرسراتی ہوئی، رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز تا دیر اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

آئینے کے سامنے کھڑی وہ ہر زاویے سے اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے اپنا بہترین سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور پچھلے کئی منٹوں سے اس کی نگاہیں آئینے میں اپنے عکس پر جمی تھیں۔ آج جمعرات تھی۔ وہ اوینل کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے گھر سے کالج کے لیے نکلنا تھا۔ کل جو تحائف اس نے انیلا کے پاس رکھوائے تھے، وہ کالج گیٹ پر انیلا سے وصول کرتی اور پھر مقررہ وقت پر اوینل اسے لینے آ جاتا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی اس کے گھر سے نکلنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ بہت جلدی اٹھ کر تیار ہونے لگی تھی۔ نیچے امی بھی اسکول کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ وہ عموماً اس سے پہلے روانہ ہو جایا کرتی تھیں۔

کال بیل کی آواز نے سوچوں کا تانا بانا بکھیر دیا تھا۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتی رہی مگر امی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر سیڑھیوں کی جانب بڑھی، وہ شاید باتھ روم میں تھیں۔ اسی لیے دروازہ اب تک نہیں کھولا تھا۔ کال بیل دوبارہ بجی۔ وہ جھنجھلا کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

ابھی وہ نیچے نہیں پہنچی تھی کہ امی دروازے کی جانب بڑھتی دکھائی دیں۔ وہ وہیں سے پلٹ کر دوبارہ آئینے کے سامنے جم گئی تھی۔

''کیا ہے مجھ میں جس کی بنا پر اونیل مجھ سے محبت کرتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ میری آنکھیں.....'' اس نے پلکوں پر مسکارا لگاتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''بالکل عام سی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ان میں..... میرے گال.....'' اس نے رخساروں کو ہاتھ لگایا۔

''ایسا چہرہ، ایسی رنگت تو ہزاروں لڑکیوں کی ہوگی۔ اس نے مجھے کیوں چنا۔ میری گردن.....'' لاکٹ کا ہک بند کرتے ہوئے وہ اپنی گردن کا جائزہ لینے لگی۔ ''میری گردن خوبصورت تو ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ اونیل اس پر توجہ دے..... وہ تو دیوتا ہے۔ میں کیا ہوں اس کے مقابل..... میری حیثیت اس کے سامنے ایک حقیر داسی سے زیادہ نہیں..... اس نے محبت کے لیے میرا انتخاب کیوں کیا.....؟'' وہ شکر گزاری سے بچھی جا رہی تھی۔

نچلے کمرے سے کسی عورت کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آواز مانوس لگتی تھی لیکن وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔ ''کوئی ہمسائی ہوگی۔ سسرال کی برائیاں کرتے ہوئے یہ شادی شدہ عورتیں کس قدر جذباتی ہو جاتی ہیں۔'' کندھے جھٹک کر وہ گھنے سیاہ بالوں میں برش کرنے لگی۔

بہت دیر تک وہ اپنے نقوش کو چھو کر دیکھتی رہی تھی۔ جب بھی آئینے کے سامنے سے ہٹنے لگتی، اسے تیاری میں کوئی سقم محسوس ہونے لگتا۔ کبھی آئی شیڈ گہرا ہو جاتا تو کبھی لپ اسٹک کا رنگ پھیکا اور بے جان لگنے لگتا۔ وہ نئے سرے سے خود کو سنوارنے کے جتن کرنے لگتی۔ جب وہ نیچے اتر رہی تھی، اس وقت بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔ اس کے خیال میں اس نے بلش آن کا درست شیڈ منتخب نہیں کیا تھا۔

باہر آنے سے قبل اس نے سر اور شانوں کے گرد گرم شال کو اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ تاکہ امی اس کی غیر معمولی تیاری کو محسوس نہ کر سکیں۔ وہ عورت جا چکی تھی۔ امی اکیلی بیٹھی تھیں۔

ایک لحظہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سیڑھیاں اپنی جگہ سے کھسک گئی ہوں، امی کے سامنے میز پر جو کچھ موجود تھا، اسے دیکھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی واپس جائے اور خود کو کمرے میں بند کر لے۔ مگر اس ارادے پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اس کا نچلا دھڑ پتھر کا ہو چکا تھا۔

اسے دیکھ کر امی اپنی جگہ سے اٹھ کر آئیں اور اس کا بے جان ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے

گھسیٹ لیا۔

''انیلا کی امی آئی تھیں۔ کچھ چیزیں دے گئی ہیں۔ دیکھو گی وہ کیا لے کر آئی ہیں۔'' امی کی آواز کسی بازگشت کی مانند لہرائی۔ اس کی آنکھیں فرش پر جمی رہیں۔

''یہ دیکھو..... وہ میز سے ڈبے اٹھا اٹھا کر اس کے منہ پر مارنے لگیں۔ ''دیکھو انہیں، تمہاری شاپنگ ہے نا یہ..... کہیں وہ غلطی سے تو نہیں دے گئیں۔'' انہوں نے پھٹے ہوئے پھول دار ریپر مٹھیوں میں بھینچ کر اس کے قدموں میں اچھالے تھے۔ وہ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی تھی۔

''پیسے کم تو نہیں پڑ گئے تھے۔ کسی اونچے شاپنگ مال سے خریدی ہوئی چیزیں لگتی ہیں۔'' پھولوں کا بوکے اس کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ اس کی پلکوں نے جنبش نہیں کی تھی۔

''بولو جاشیہ، مجھے کس بات کا انعام دیا ہے تم نے۔ اپنی جوانی بیوگی میں گزارنے کا، یا تمہاری خاطر ساری زندگی دھکے کھانے کا۔ میری کس نیکی کا صلہ ہے یہ؟'' وہ طیش سے لرزتی آگے بڑھیں اور اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اس کے حلق سے کراہیں نکلتی رہیں لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

''تم میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہیں اور میں سمجھتی رہی میری بیٹی..... تم ایک عیسائی کے ساتھ..... ایک عیسائی کے ساتھ.....''

ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

یقیناً وہ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ پڑھ چکی تھیں یا شاید انیلا نے اپنی امی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

''میں اس سے شادی کروں گی۔'' مار کھاتے ہوئے اس کے ہونٹ بہت آہستگی سے ہلے تھے۔

''کیا کہا تم نے؟..... کیا کہا؟..... تم اس سے شادی.....''

امی نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارا۔

''ہاں میں کروں گی۔'' ایک دم وہ بپھر کر پیچھے ہٹی۔ ''وہ مسلمان ہو جائے گا۔ میں اسی سے شادی کروں گی۔ وہ میری خاطر مسلمان ہو جائے گا۔'' وہ چلانے لگی۔

''آپ مجھے روک نہیں سکتیں۔ میرے جو جی میں آئے گا، کروں گی۔ میں اس سے محبت

کرتی ہوں۔اسی سے.....''

امی نے ایک اور تھپڑ اس کے چہرے پر مار دیا۔

''محبت.....کیا ہوتی ہے محبت؟ والدین کو دھوکا دینا محبت ہوتی ہے؟

اپنی عزت، اپنے گھر والوں کی عزت کو سر بازار نیلام کرنا محبت ہوتی ہے؟ یہ ہوتی ہے محبت؟ ایسی محبت پر لعنت ہے۔''

ان کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

''میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں نے کوئی برائی نہیں کی۔''

''غلطی تو ساری میری ہے۔ میں غلط ہوں۔ تم پر اعتماد کر کے میں نے غلطی کی ہے۔''

ان کا ہاتھ ایک بار پھر اٹھا تھا۔

وہ ان کی پہنچ سے دور ہو کر چیخی۔

''اب مجھے ہاتھ مت لگائیے گا۔ اب میں اور برداشت نہیں کروں گی۔''

''کیا کرو گی تم، کیا کر لو گی؟ بولو کیا کرو گی۔ مجھے جان سے مار دو گی؟ مار دو.....میرا گلا دبا دو.....تم نے مجھے زندہ ہی کب چھوڑا ہے۔''

وہ ان کے چہرے کو تنفر سے گھورتی رہی۔

عفت نے ہاتھ بڑھا کر اسے کندھے سے دبوچا اور اسے ساتھ لیے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ بارہا اس کا جی چاہا کہ ان سے ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ جائے مگر ان کے ساتھ گھسٹتی رہی۔

اسے کمرے میں دھکا دے کر انہوں نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا تھا۔

وہ بستر پر بیٹھ کر بند دروازے کو گھورنے لگی۔ امی کے رونے کی آواز درزوں سے چھن چھن کر اس تک پہنچ رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

دروازے پر دستک دیتے دیتے اس کی ہتھیلیاں دکھنے لگی تھیں۔ لیکن اسے اس بات کی قطعاً پروا نہ تھی۔ صبح سے وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھی۔ بغیر رکے، امی کی ڈانٹ پھٹکار، التجاؤں، منتوں کی پروا کیے بنا۔ وہ دونوں ہاتھ دروازے پر پوری قوت سے مارتی جا رہی تھی۔

امی کی آواز سنائی دیتی تو وہ چیخنے چلانے لگتی۔ اسے کمرے میں بند ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ اس دوران ایک بار بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ امی کھانا ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نچلے خلا سے اندر دھکیل دیتیں اور وہ برتن دیواروں پر دے مارتی۔ دو دن سے اس نے ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا مگر اسے بھوک پیاس کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اونیل کے علاوہ اسے کسی بھی چیز کی پروا نہیں تھی۔

''تمہیں اپنی اور میری عزت کا ذرا خیال نہیں جاشیہ؟ لوگ تمہارے شور مچانے کی وجہ پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گی۔ تم اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہو؟ تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہیں آتا؟''

عفت اسے سمجھاتے سمجھاتے عاجز آ گئی تھیں۔ اس کی وجہ سے وہ اسکول بھی نہیں جا رہی تھیں۔

''آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا تو میں آپ پر ترس کیوں کھاؤں۔ آپ کو لوگوں کی پروا ہے، میرا کوئی احساس نہیں۔ میں بہت تکلیف میں ہوں.....دروازہ کھول دیں۔ مجھ پر رحم کریں۔''

چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

''میں نے ساری زندگی تمہاری خاطر، صرف تمہاری خاطر بیوگی میں گزار دی۔ میں نے کیا نہیں کیا تمہارے لیے۔ کس چیز سے محروم رکھا؟ اچھے کپڑے، اچھا کھانا، تعلیم.....ان سب کے

بدلے میں تم میرے منہ پر کالک ملنا چاہتی ہو۔''

''میں آپ کے احسانات کی فہرست نہیں سننا چاہتی۔ ساری زندگی آپ نے کیا ہی کیا ہے سوائے احسانات گنوانے کے۔ اولاد کی خاطر تمام والدین یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ آپ نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔ اور کچھ کیا بھی ہے تو اس میں میری خواہش شامل نہیں تھی۔ میں نے آپ سے کوئی قربانی نہیں مانگی۔ آپ دوسری شادی کر لیتیں، مجھ سے بھیک منگوا لیتیں۔ آپ جیسے بھی رکھتیں، میں رہ لیتی۔ کاش آپ مجھے کچھ بھی نہ دیتیں لیکن مجھے انسان سمجھتیں۔ اپنی اولاد سے تو جانور بھی پیار کرتے ہیں۔ آپ کیسی ماں ہیں؟ آپ مجھے تکلیف میں دیکھ کر خوش ہیں۔''

اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل ہوگئی۔

''عیسائی سے شادی کرو گی۔ اس کا مطلب جانتی ہو تم؟ تمہیں اللہ سے خوف نہیں آتا؟''

''اللہ کا خوف..... آپ کو اللہ کیسے یاد آ گیا امی؟ آج کیسے آپ نے اس کا نام لے لیا۔ میں نے آپ کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ ساری زندگی آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اب آپ مجھے اس کا خوف دلا رہی ہیں، آپ نے تو مجھے لوگوں سے ڈرنا سکھایا ہے۔ معاشرے سے خوف کھانا سکھایا، اللہ سے ڈرانا تو آپ بھول ہی گئیں۔ اب میں کیسے ڈر جاؤں؟

میں کوئی گناہ نہیں کر رہی۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ آپ کو عیسائی سے شادی کرنے پر اعتراض ہے ناں، جب وہ اپنا مذہب ہی چھوڑ دے گا تو آپ کس لیے مجھے روک رہی ہیں۔ آپ کو اعتراض ہے تو میری خوشی پر، اعتراض ہے تو صرف اس بات پر کہ میں نے اپنے بارے میں خود فیصلہ کیوں کر لیا۔ آپ کے سامنے سر جھکا کر کیوں نہیں بیٹھی رہی۔ یہی بات آپ کو دکھ دے رہی ہے ناں۔ آپ سے برداشت نہیں ہوتا کہ آپ کی بیٹی اپنی پسند سے شادی کر لے۔ مذہب کا تو محض ایک بہانا ہے میں کسی غیر مسلم سے شادی کرتی تو بے شک آپ مجھے روک لیتیں۔ لیکن میں تو مسلمان سے شادی کروں گی۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو، لیکن میری عقل ابھی سلامت ہے۔ میں تمہیں یہ من مانی ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ اور کان کھول کر سن لو، اگر تم نے اونیل سے ملنے کی کوشش کی یا وہ ہمارے گھر آیا تو میں پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ کر دوں گی۔'' ان کے قدموں کی چاپ کو دور ہوتے سن کر

جانیہ پھر سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

''آپ اللہ کی بات کرتی ہیں، اللہ تو جبر کرنے کو نہیں کہتا۔ وہ تو نہیں کہتا.....'' اس نے اسٹول اٹھا کر دروازے کی سمت اچھال دیا اور فرش پر گر کر رونے لگی۔

زندگی میں پہلی بار اسے اپنی ماں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا کا ہر وہ شخص اس کا دشمن تھا جو اس کے اور اونیل کے درمیان آ جاتا۔

''اس نے میرا کتنا انتظار کیا ہوگا اور مجھے نہ دیکھ کر کس قدر مایوس ہوا ہوگا۔'' وہ دھندلی آنکھوں سے دیواروں پر رینگتی مضمحل زرد روشنی کو دیکھنے لگی۔

''پتا نہیں اس نے کیا سوچا ہو، وہ صرف میرے لیے تو واپس آیا تھا۔'' دیواریں پانی میں ڈوبنے لگیں۔

''میں کیا کروں، کہیں وہ واپس نہ چلا جائے؟'' وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ ''میں مر جاؤں گی، میں نہیں رہ سکتی، اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

جانے کتنی دیر وہ کمرے کے طول و عرض میں بھٹکتی رہی۔ اس کی ٹانگیں تھکن سے شل ہوگئیں۔ کھڑکی کے سامنے ٹھہر کر اس نے نم آنکھوں کو پونچھا تھا۔

''ٹھیک ہے..... ایسے ہی ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھے تکلیف میں دیکھ کر خوش ہیں تو مجھے بھی آپ کو دکھ دیتے ہوئے افسوس نہیں ہوگا۔ آپ نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے ہی سہی۔'' وہ کھڑکی کی جالی پر ہاتھ پھیلائے بڑبڑانے لگی۔

✠ ✠ ✠

کچن سمیت گھر کا تقریباً تمام کام رفتہ رفتہ اس پر لاد دیا گیا تھا۔ جواب دینے کی، انکار کرنے کی ہمت اس میں تھی نہیں۔ اس لیے سب کچھ خاموشی سے نپٹا رہی تھی۔

فجر کی نماز پڑھ کر ناشتا تیار کرنا شروع کرتی۔ یہ سلسلہ عموماً سات بجے تک جاری رہتا، کیونکہ گھر کے ہر فرد کو مختلف طرز کا ناشتہ مختلف اوقات میں درکار تھا۔ اس کام سے فراغت پا کر برتن دھوتے، بستر سمیٹتے، کمروں اور صحن میں جھاڑو لگاتے اتنی دیر ہو جاتی کہ روزانہ ہی پہلا پیریڈ چھوٹ جاتا۔ شروع کے چند دنوں میں اس نے صدف کو ناشتہ کی تیاری سے فارغ ہو کر کالج کے لیے تیار

ہوتے دیکھا تھا، برتن دھونا اور صفائی وغیرہ تائی جان کر لیتی تھیں۔ جب وہ واپس آتیں تو تائی جان پیاز، ادرک، لہسن چھیل بنا کر، سبزی کاٹ کر رکھ چکی ہوتیں، صدف ہانڈی بنا لیتی اور تائی جان روٹیاں ڈال لیتیں۔

لیکن اب یہ سب امور وہ اکیلی انجام دے رہی تھی۔ تائی جان سبزی بنانے کی عادت بھی فراموش کر بیٹھی تھیں چاہے اسے آتے آتے تین بج جاتے۔ سبزی یا گوشت کا لفافہ جوں کا توں دھرا ہوتا۔

آج اسے لوٹنے میں خاصی دیر ہوگئی تھی۔ ایک تو بس نے ہی طویل انتظار کے بعد اٹھایا تھا۔ باقی کسر ٹائر پنکچر ہونے سے پوری ہوگئی۔ پندرہ بیس منٹ ٹائر تبدیل کرنے میں صرف ہوگئے تھے۔ دہلیز سے اندر قدم رکھتے ہوئے عجی کے چہرے پر جو تاثرات نظر آئے تھے، وہ اس کی بھوک کی شدت کو سمجھانے کے لیے کافی تھے۔ کتابیں پھینک کر وہ کچن کی طرف بھاگی۔ تائی جان اور صدف دونوں ہی گھر میں نہیں تھیں۔ تایا جی دوپہر کا کھانا کھاتے ہی نہیں تھے۔ وہ حسب عادت بیٹھک میں سو رہے تھے۔

گوشت کا شاپر ڈیپ فریزر میں دیکھ کر اس نے سالن بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دو انڈے نکال کر کچن میں آئی، آملیٹ تیار کیا۔ تین پھلکے بنا کر عجی کے سامنے لا رکھے۔ وہ اتنا غصے میں لگ رہا تھا کہ عائشہ کو اس کے پاس جاتے ہوئے ہلکا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ آملیٹ پر ڈالی، ہاتھ سے ٹرے کو پرے دھکیلا اور قہر مان نظروں سے عائشہ کو دیکھا۔ اس کی پلکیں گالوں سے چپک گئی تھیں۔ سوٹ والے واقعہ کے بعد عجی نے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ اگر بات کرنا ناگزیر ہوتا تو صدف سے کہتا۔ ''اسے یہ بتا دے، یا اس سے پوچھ۔'' اب تو صدف بھی موجود نہیں تھی۔ وہ کسی زہر افشانی کی منتظر نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

''زہر لگتا ہے مجھے انڈا، چار بجے روٹی ملی تو کھانی نصیب نہیں، بڑی ریجھ (چاؤ) سے پٹھ کا گوشت لایا تھا۔ جی آج بھنا ہوا گوشت اور پودینے کی چٹنی بنے گی۔ پر یہ گھر تو دوزخ ہے۔ ادھر کسی کو کیا پروا۔ مجھے پتا ہوتا تو ہوٹل جا کر کوئی موہرا (زہر) کھا لیتا۔ چار بجے تک بھکھا بھانا بیٹھا نہ رہتا۔ صدف اوئے صدف.....'' شاید وہ بھول گیا تھا کہ صدف گھر میں نہیں تھی۔

''وہ گھر میں نہیں ہے۔''

''میں نے تجھ سے پوچھا ہے۔'' وہ شعلے کی طرح بھڑکا۔

''سالن بننے میں تو دیر لگ جائے گی۔ اس لیے میں نے.....''

''تو نہ بنا، میرے سر احسان ہے کوئی۔ اوئے تجھے کہا کس نے ہے ہمارے گھر کے کام کرنے کو، تجھ سے پہلے بھی نظام چل رہا تھا۔ بھوکے نہیں رہتے تھے، میں ذرا صدف کی طبیعت صاف کرتا ہوں، اس نے کیا دتیرہ پکڑ لیا ہے کالج سے آ کر سیر کرنے چلی گئی ہے، نکمی سارے جہاں کی۔''

وہ چپ چاپ سنتی رہی، اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ چلی جائے یا کچھ اور بنانے کا پوچھے۔

''ادھر کھڑی میری شکل کیا دیکھ رہی ہے۔ اب لے جا اسے یا میں اٹھا کر پھینکوں۔''

اس نے ٹرے اٹھائی اور کچن میں آ کر پیاز کاٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد عجی ڈھیلے قدموں سے چلتا ہوا آیا اور پیڑھی پر رکھی ٹرے اٹھالی۔

''تازہ روٹی پکا دوں؟ ٹھنڈی ہوگئی ہوں گی؟'' پیاز دھوتے ہوئے اس نے بے تاثر آواز میں پوچھا۔

'رہن دے۔ بڑی مہربانی تیری۔''

وہ خالی برتن اٹھانے لگی تو عجی برآمدے کے ستون سے پشت ٹکائے دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبا ہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

اسے قدرے اچنبھا ہوا، ناراضی کا نشان تک باقی نہ تھا۔

برآمدے میں پھیلے ملگجے اندھیرے اور دیواروں پر سرسراتی خوشگوار ہوا کو محسوس کر کے اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ سیاہ اور سرمئی بادلوں کی ٹکڑیاں یہاں سے وہاں تک ٹنڈی دل کے جھنڈ کی مانند چھا رہی تھیں۔ ساتھ والے گھر میں نیم کا جغادری پیڑ ہوا کی لے پر حال کھیل رہا تھا۔ دیوار کی منڈیر پر بیٹھی گوریاؤں کے پر پھولے ہوئے تھے، ساری فضا سرمئی ہو رہی تھی۔

''تم سے الفت کے تقاضے نہ نبا ہے جاتے

تم سے الفت کے تقاضے.....''

عجی سینے پر ہاتھ باندھے آسمان پر نظریں جمائے ایک مصرع کی گردان کیے جا رہا تھا۔

''لے بھئی۔ یہ بارش ٹھنڈ لے آئے گی۔ اگر ہوگئی تو سمجھو سردیاں شروع۔'' معلوم نہیں وہ اس سے مخاطب تھا یا اپنے آپ سے۔ ''ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے.....'' وہ پھر سے گنگنانے لگا۔

عائشہ صحن میں رکھی چارپائی گھسیٹ کر برآمدے میں لائی اور جا کر کچن میں مصروف ہو گئی۔

''میں ابھی آ رہا ہوں۔ دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کچن کی کھڑکی سے اس نے عجی کو جاتے دیکھا تھا، وہ بہت خوش لگتا تھا۔

اس کے لوٹنے سے قبل ہی بارش شروع ہوگئی تھی۔ چند لمحوں میں بارش کسی بپھرے ہوئے ناگ کی طرح شور کرنے لگی۔ بوندوں کی تیز بوچھاڑیں برآمدے سے کچن کی کھڑکی تک پہنچ رہی تھیں۔ جالی کے سوراخوں میں سے اڑتے چھینٹے وقفے وقفے سے اسے بھگو جاتے۔ ماحول میں نم آلود خنکی رچی تھی۔

تایا جی بیٹھک سے نکل آئے تھے۔ اس نے چائے کا پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا، چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر وہ یونیفارم تبدیل کرنے کا سوچ کر جانے لگی تھی کہ بارش میں بھیگتا ہوا عجی آ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک شرابور تھا۔ قمیص کے دامن تلے چھپایا ہوا لفافہ اسے پکڑا کر وہ گیلے بالوں کو ہاتھوں سے جھاڑنے لگا۔

''سموسے ہیں، پلیٹ میں ڈال کر برآمدے میں لے آ۔ بارش میں گرما گرم سموسے کھانے کا مزا ہی اور ہوتا ہے۔''

''میں تایا جی کے لیے چائے بنا لوں۔''

''او بن جائے گی چائے بھی۔ بارش رک گئی تو پھر فائدہ سموسے کھانے کا۔'' اس نے یوں کہا جیسے بارش اور سموسے ایک دوجے سے علیحدہ نہ ہو سکتے ہوں۔

''تجھے بارش اچھی نہیں لگتی؟''

''لگتی ہے۔'' وہ پتیلی میں کھولتے سیاہی مائل بھورے پانی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''لگتی ہے تو پھر باہر آ کر دیکھ۔ کیا ماحول بنا ہوا ہے۔ یہاں کیوں گھسی بیٹھی ہے۔''

''میں سن رہی ہوں۔''

''کر لو بات، بارش کوئی سننے کی چیز ہوتی ہے۔ کملوں، (پاگلوں) والی بات کی ہے تو نے، بارش تو دیکھنے کی شے ہے۔'' اس نے لمبی سانس بھر کر کھڑکی سے اندر آتی بھیگی ہوا کو سینے میں اتارا۔

''کیا شے ہے بارش بھی۔ جلدی سے باہر آ جا۔ کہیں رک ہی نہ جائے۔ اس کا اعتبار بھی تو کوئی نہیں۔''

اس نے پتیلی میں دودھ انڈیلا اور آنچ تیز کر دی۔ بارش کے شور کے سنگ اس نے بیرونی دروازے پر دستک کی مدھم آواز سنی تھی۔ عجی ساتھ والے کمرے میں تولیے سے کپڑے خشک کر رہا تھا اور تایا جی برآمدے میں چارپائی پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ وہ خود ہی دروازہ کھولنے چلی گئی۔ باہر گلی میں دس بارہ سال کا ایک مدقوق چہرے والا میلا کچیلا لڑکا چیتھڑے لٹکائے، ننگے پاؤں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے انگلی اٹھا کر منہ کھولا۔ اس کے پیلے دانت عائشہ کو دکھائی دیئے۔ مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید وہ گونگا تھا۔ بار بار پچکے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر وہ انگلی اٹھاتا اور منہ کھول دیتا۔

وہ اسے رکنے کا اشارہ کر کے کچن میں آئی۔ سموسوں والی تھیلی کھول کر دیکھا۔ تھیلی میں پانچ سموسے اور چٹنی کے دو پیکٹ تھے۔ اس نے تین سموسے اور چٹنی کا ایک پیکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھا اور تھیلی کو سمیٹ کر دوپٹے تلے چھپا کر لے گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عجی اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھے۔ یقیناً وہ خفا ہوتا۔ تھیلی اس لڑکے کو تھما کر جب وہ پلٹی تو عجی کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

اس کی آنکھوں میں سلگتی ہوئی گیلی لکڑیوں سے اٹھنے والا گاڑھا دھواں بل کھا رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کے قریب سے گزر کر گلی میں نکل گیا تھا، وہ چھینٹے اڑاتی بارش اور شور مچاتی ہوا، میں گھری نادم سی کھڑی رہ گئی تھی۔

✠ ✠ ✠

جاشیہ نے پلکیں جھپک کر آنکھوں میں تنی نمی کی چادر کو ہٹایا اور باتھ روم کے روشندان کو پرامید نظروں سے دیکھا۔ اس کے دل میں لہری اٹھی۔ روشندان کا حجم اتنا تھا کہ وہ کسی قدر دقت کے ساتھ سمٹ سمٹا کر اس میں سے گزر سکتی تھی۔ اسے کمرے میں بند ہوئے شاید چوتھا یا پانچواں دن تھا اور آج پہلی بار امی اسے اکیلا چھوڑ کر گئی تھیں۔ ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ اور مجبوراً انہیں گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ اسے ان کی بیماری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسے صرف یہ بات خوشی دے رہی تھی کہ اسے یہاں سے نکلنے کا ایک موقع میسر آ گیا تھا۔

آج دوپہر سے رات گئے تک امی دروازے کے پاس بیٹھی روتی رہی تھیں، اس کی منتیں کرتی رہی تھیں۔ اپنے بڑھاپے، بیماری اور تنہائی پر رحم کھانے کی فریادیں کرتی رہی تھیں۔ اسے ان کے آنسوؤں پر ایک لمحے کے لیے بھی ترس نہیں آیا۔ ان کی گریہ وزاری اسے ڈھکوسلہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ تمام وقت پتھر آنکھوں کے ساتھ ایک ہی فقرہ دہراتی رہی۔

''مجھے اونیل سے ملنے دیں۔'' اس ایک فقرے کے علاوہ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ پھر امی اونچی آواز میں رونے لگی تھیں۔ روتے ہوئے انہیں قے آ گئی تھی، قے میں خون کی آمیزش تھی۔ انہوں نے ہچکیاں لیتے ہوئے اسے بتایا تھا، اسے اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ دروازے سے پشت ٹکائے ساکت بیٹھی رہی تھی۔

اور اب وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کے پاس کچھ وقت تھا اور وہ اس قیمتی وقت کو کسی بھی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ جب سے وہ کمرے میں بند تھی تب سے مسلسل فرار کے راستوں پر غور کرتی رہی تھی۔ اور ایک واحد راستہ جو اسے سجھائی دیا تھا، وہ باتھ روم کا روشندان تھا۔ امی کے گھر سے جاتے ہی وہ روشندان کے نیچے جا پہنچی تھی۔

اس نے دیوار سے لپٹے پائپ کا سہارا لے کر فلش ٹینک پر پاؤں رکھا اور بدن کی پوری قوت صرف کر کے اس پر کھڑی ہوگئی۔ اب اس کے بازو روشندان کے چوکھٹے تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ اتنے دنوں سے کچھ کھائے پیے بغیر رہنے سے اس پر شدید نقاہت طاری تھی۔ سر بار بار ڈول جاتا اور دیواریں اپنی جگہ سے ہٹتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ فلش ٹینک کی سطح چکنی تھی، اس کی ٹانگوں کی لرزش اسے قدم جمانے نہیں دے رہی تھی۔ جیسے ہی پائپ کو چھوڑ کر اس نے روشندان کی جانب بازو اٹھائے، اس کے جسم نے جھکولا کھایا اور وہ توازن کھو کر پورے وزن کے ساتھ نیچے گر

گئی۔ اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔ اس کا سر جیسے دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ پائپ کو دیوار میں نصب کرنے والی لوہے کی نوکیلی پتری کسی برچھی کی مانند اس کی پیشانی میں گھس گئی تھی۔

اس کے اعصاب پر تاریکی پنجے گاڑنے لگی تھی۔ بڑی دقت سے ہاتھ اٹھا کر اس نے ماتھے کو چھوا تھا۔ اس کی انگلیوں نے چپچپاہٹ محسوس کی تھی۔ گاڑھا سرخ مائع اس کی بھنوؤں سے ہوتا ہوا آنکھوں کے پپوٹوں اور پلکوں پر جمنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں صرف دو رنگ دیکھ سکتی تھیں۔ سرخ اور سیاہ ان دو رنگوں کے سوا وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ یخ بستہ فرش پر لیٹے لیٹے اس نے آستین سے پیشانی کو رگڑا تھا اور اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے گھٹنوں پر بھی شدید ضربیں لگی تھیں۔ اٹھنے کی جدوجہد کرتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ کبھی اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی لیکن وہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کا پورا جسم آندھی کی زد میں آئے ہوئے تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ درد کی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوک نگلا تھا۔ اس کا دل بہت آہستگی سے دھڑک رہا تھا۔

دیوار کو تھام کر لڑکھڑاتی ہوئی وہ واش بیسن تک گئی تھی اور نل کھول کر برفیلے پانی کے چھپاکے ماتھے اور چہرے پر مارنے لگی تھی۔ چند ثانیے بعد اسے اپنا دھندلا سا عکس آئینے میں نظر آنے لگا تھا۔ سر میں پھیلنے والی شدید ٹیسیں بار بار اس کے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ واش بیسن کے کناروں پر ہاتھ رکھے وہ دیر تک ہانپتی رہی تھی۔ درد کی چبھن ناقابل برداشت تھی لیکن اونیل سے دور رہ کر وہ جس تکلیف میں تھی، یہ درد اس تکلیف سے کہیں کم تھا۔ کسی قدر سنبھلنے کے بعد وہ دوبارہ فلش ٹینک پر چڑھی، ہتھیلی سے ضرب لگا کر جالی کو باہر دھکیلا اور کانپتی انگلیاں چوکھٹے کے کناروں میں پھنسا دیں۔ بازوؤں پر زور ڈال کر وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس کے بازو بالکل بے جان ہو رہے تھے۔ نچلا دھڑ گیلی مٹی کا بوجھل ڈھیر تھا۔ اس کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ پیر بائیں طرف والی دیوار میں ابھری چوبی الماری کے پٹ پر جمائے وہ خود کو اوپر دھکیلنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت نچلے ہونٹ میں سختی سے پیوست تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ اوپری دھڑ کو چوکھٹے سے باہر لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس جدوجہد میں اس کی کہنیاں بری طرح چھل گئی تھیں۔ مگر وہ تکلیف کو فراموش کیے اس خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو شاید کچھ دیر بعد اس کا مقدر بننے والی تھی۔ اگلا مرحلہ نسبتاً آسان تھا۔ جسم کو موڑتے ہوئے بازو جھلا کر

اس نے دیوار کو ٹٹولا۔ پانی کی ٹینکی سے اترتی ہوئی لوہے کی سیڑھی کا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ سانس روک کر اس نے خود کو مزید کھینچا اور کمر تک باہر لٹک آئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا ہاتھ بھی ڈنڈے پر جما کر وہ آہستہ آہستہ ٹانگوں کو اوپر کی سمت سمیٹنے لگی تھی چوکھٹے سے پاؤں علیحدہ کرتے ہوئے اس کا توازن بگڑا اور وہ دو فٹ نیچے پھیلے ہوئے چھجے پر گر گئی۔ بہت دیر تک وہ مردہ چھپکلی کی مانند بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ جب اٹھنے کے لیے پہلو بدلا تو اسے ناکامی ہوئی تھی۔ اس میں ذرا سا ہلنے کی سکت بھی باقی نہیں تھی۔ بے بسی سے اس کی آنکھیں گرم پانی سے بھرنے لگیں۔

سرمئی ریشم کے لچھے جیسی رات اس پر جھکی ہوئی تھی۔ رات کا سرد تنفس اس کی سانسوں سے الجھتا تھا۔ اس کا نڈھال وجود رات کے ملائم بدن میں دھنستا چلا جاتا تھا۔ رات کی نرم سانسیں اسے دھیرے دھیرے سہلا رہی تھیں۔

ایک بار اس نے اونیل کی بے خبری میں اس کے بالوں کو چھو کر دیکھا تھا۔ وہ اس مہربان رات جیسے ملائم تھے۔ ان کا لمس اس رات کے لمس سے کتنا مشابہہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ رات اسے اپنے سرد اور سیاہ بازوؤں میں لے کر آسمان کی اور اڑنے لگی۔ شاید اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ سر کو جھٹک کر اکڑی ہوئی ہتھیلیاں چھجے کی کھردری سطح پر جما کر وہ اٹھ گئی۔ کھڑے ہوتے ہوئے وہ کئی بار آگے پیچھے جھول گئی تھی۔

لوہے کی سیڑھی اس کے سامنے تھی اور دسترس میں بھی تھی۔ خوابیدہ سڑک پر قدم جما کر وہ زور زور سے سانس لینے لگی تھی۔ سمت کا تعین کرنے میں اسے کچھ وقت لگا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی، کس طرح وہ ماہم اپارٹمنٹس کی چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچی۔ بس اتنا یاد تھا کہ پیروں کے تلوے جب یخ بستہ سڑک سے ٹکراتے تھے تو سر میں کوئی میخیں گاڑنے لگتا تھا۔

دروازہ کھلنے پر جوں ہی اونیل اس کی نظروں کی زد میں آیا، وہ کسی ننھی بچی کی طرح ہمک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

''میں مر جاتی اونیل..... تمہارے بغیر۔ میں ختم ہو جاتی۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تم سے دور.....'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''کیا ہوا جاشیہ؟ مجھے بتاؤ تو کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا گیا تھا۔

''تمہیں نہیں پتا، میں کیسے زندہ رہی، تم نہیں جانتے۔ میں کتنی تکلیف میں تھی۔ کیسے زندہ رہی۔ تمہیں نہیں پتا۔''

اونیل اسے ساتھ لیے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ اس کے کندھے سے چمٹی چلائے جا رہی تھی۔

''آہستہ بولو پلیز! رات کا وقت ہے، ہم کسی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ تم تو کانپ رہی ہو، اتنی سردی میں بغیر جوتوں کے۔'' اس کا دھیان جاشیہ کے ننگے پیروں کی طرف گیا تھا۔ اسے خود سے علیحدہ کر کے وہ بیڈ پر سے کمبل اٹھا لایا اور اس کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا۔

''روؤ مت..... مجھے بتاؤ، تمہارے سر پہ چوٹ کیسے لگی۔ اتنی رات کو تم گھر سے کیوں نکلیں؟ پلیز رونا بند کرو جاشیہ! یہاں بیٹھو آرام سے۔'' اس نے شانوں سے تھام کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ اور خود اس کے قریب بیٹھ کر انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

وہ بمشکل ہچکیوں کے درمیان بتانے لگی۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

''تم نے ٹھیک کیا جو بھی کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اب میں تمہارے پاس ہوں ناں۔'' اونیل نے نیند کے خمار سے سرخ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟''

''میں بڑی مشکلوں سے انیلا سے ملا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہارے خریدے ہوئے گفٹس اس کی امی نے دیکھ لیے تھے اور پھر جو بھی ہوا، میں انتظار کر رہا تھا کہ حالات صحیح ہو جائیں، تمہاری امی کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا پڑ جائے تو تمہارے گھر جاؤں، میں بس ایک دو روز میں تم سے ملنے کے لیے آنے ہی والا تھا۔ میں روزانہ کالج کے گیٹ پر تمہارا انتظار کرتا رہا۔ بلیومی، ایک ایک لمحہ میں نے گن گن کر گزارا۔ میں تمہاری خاطر ہی تو ٹھہرا ہوا تھا۔'' وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

''تم نے انیلا کو کیا بتایا ہے میرے بارے میں، کیا اسے پتا ہے کہ میں اوکاڑہ میں رہتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔

جاشیہ کی گردن نفی میں ہلی۔

''میں نے اسے اتنا ہی بتایا تھا کہ میں تم سے ملتی ہوں، اور تم میرے لیے مسلمان ہونا

چاہتے ہو اور بس۔ اسے تو اس فلیٹ کا پتا بھی معلوم نہیں۔''

''چوکیدار نے تمہیں یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا، تم انکوائری آفس کے سامنے سے گزر کر آئی ہو یا پچھلی طرف کی سیڑھیوں سے؟'' اس کی پریشانی برقرار تھی۔

اسے یاد نہیں تھا کہ راستے میں کتنے لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ بلڈنگ کی طرف سے آتے ہوئے ایک شخص نے اسے روکنے کی کوشش تو کی تھی لیکن وہ چوکیدار تھا یا کوئی اور..... اس بارے میں وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ نہ تو اس کے آواز دینے پر رکی تھی۔ اور نہ ہی اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''مجھے یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔'' وہ اونیل کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ ''تم بالکل پریشان مت ہو۔ ہم صبح ہی یہ فلیٹ چھوڑ دیں گے۔ اب کوئی تمہیں مجھ سے دور نہیں رکھ سکتا۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ پھر تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔''

وہ کچن میں اونیل کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''تم بیٹھی رہو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ دروازے کا پٹ تھامے کھڑی رہی۔

اونیل نے اپنے ہاتھ سے اسے گرم گرم سوپ پلایا تھا۔ سوپ کے گھونٹ حلق سے اتار کر وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

''یہاں سے قریب ہی ڈاکٹر شریف کا گھر ہے۔ میرا دوست ہے وہ۔ میں ذرا کپڑے چینج کر لوں۔'' وہ اٹھنے لگا تو جاشیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم کہیں مت جاؤ۔ میرے پاس بیٹھے رہو۔ میں ٹھیک ہوں، مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرے پاس رہو پلیز۔''

وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ اور اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ کر اس کے بال سہلانے لگا تھا۔

وہ اونیل کے متبسم چہرے پر نظریں جمائے دیر تک اس کے نقوش دیکھتی رہی۔ وہ کبھی آنکھیں بند نہ کرتی۔ اگر نیند اسے پسپا نہ کر دیتی۔ بند ہوتی آنکھوں میں اس کا عکس منجمد ہو گیا تھا۔

خواب میں بھی وہ چہرہ ذہن کے افق پر چھایا رہا تھا۔

✠ ✠ ✠

''جو ہوا سو ہوا۔ اچھا ہوا یا برا۔ اس بحث سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم کسی چیز کو لوٹا نہیں سکتے۔ اب ہمیں ان حالات کے ساتھ رہنا ہے میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ تمہیں جو بہتر لگا تم نے کیا۔ مگر تمہارے اس طرح گھر چھوڑ آنے سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اب جو کچھ میں تم سے کہنے لگا ہوں، اسے سن کر شاید تم پریشان ہو جاؤ لیکن میں کوئی بھی بات تم سے چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ ہمیں اپنے مسائل کو خود ہی حل کرنا ہے۔ کوئی دوسرا ہمارے لیے کچھ نہیں کرے گا۔''

نکاح کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ہی اونیل نے ایسی تمہید باندھی تھی جسے سن کر وہ پریشان ہو گئی۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں فی الحال اس شادی کو ڈکلیر نہیں کر سکتا۔''

''تم مجھے اپنے ساتھ اوکاڑہ نہیں لے جاؤ گے؟''

''پہلے میری پوری بات سن لو جاشیہ! کوئی سوال مت کرو۔''

وہ خاموش ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

''میں تمہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں، تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں نے تمہارے لیے اپنا سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ضرور جاؤ گی لیکن میرے گھر میں نہیں رہو گی۔ میں تمہیں کالج میں ایڈمیشن لے دوں گا۔ تم ہاسٹل میں رہو گی۔ اس وقت تک جب تک حالات میرے قابو میں نہیں آ جاتے۔''

''یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' جاشیہ نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ ''تم تو اکیلے رہتے ہو۔ تمہیں کس کا ڈر ہے اور کالج میں ایڈمیشن کیسے ہو گا میرے ڈاکومنٹس میرے پاس نہیں ہیں۔ میں پڑھنا بھی نہیں.....

''ڈاکومنٹس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ سب میں کر لوں گا۔ بہتر ہے۔ تم اپنا گریجویشن کمپلیٹ کر لو۔ میں چاہتا ہوں، تم پڑھائی مکمل کرو۔''

''میں تمہارے ساتھ رہ کر بھی.....''

اونیل نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ''میری پوری بات سننے سے پہلے کچھ مت کہو۔ تم سے دور رہ کر میں کب خوش ہوں، مگر بہتر زندگی کے لیے ہمیں کچھ سیکری فائسز (قربانیاں) کرنی پڑیں گی۔ تم بھوکی رہ سکتی ہو؟ اچھے کپڑوں کے بغیر، گیس، بجلی، فرنیچر، سوسائٹی میں عزت کے بغیر رہ سکتی ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا تو جاشیہ حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اگر تم ان سب چیزوں کے بغیر رہ سکتی ہو تو پھر ہمیں علیحدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا ریسٹورنٹ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ ریسٹورنٹ کی زمین بے شک میرے نام ہے۔ لیکن بلڈنگ میں ایک پیسہ بھی میرا نہیں۔ سارا روپیہ میرے فادر لگا رہے ہیں۔ اگر انہیں معمولی سی بھنک بھی پڑ جائے کہ میں مسلم ہو چکا ہوں اور ایک مسلم لڑکی سے شادی کر چکا ہوں تو وہ روپیہ بھیجنا بند کر دیں گے۔ گھر بھی ان کے نام ہے۔ پراپرٹی میں سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی مجھے۔ میری ساری کمیونٹی مجھ سے قطع تعلق کر لے گی۔ ریسٹورنٹ کو مکمل کرنے اور چلانے کے لیے ابھی ڈھیروں روپے کی ضرورت ہے، وہ کہاں سے آئے گا، مجھے تو کہیں سے لون بھی نہیں ملے گا۔ میں مکمل طور پر اپنے ڈیڈی کے رحم و کرم پر ہوں۔ اور ان کی ناراضی میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ ریسٹورنٹ میرا خواب ہے جاشیہ، میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ صرف کچھ عرصہ۔ تھوڑا سا وقت ہم یہ سختی جھیل لیں، اس کے بعد مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہوگی۔ پراپرٹی میں سے کچھ ملے نہ ملے۔ کچھ ہی عرصے کی تو بات ہے، زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال۔'' اونیل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ نم آنکھوں سے ونڈ اسکرین کو گھورتی رہی۔ ''ڈیڑھ سال۔'' اس کے ہونٹ آہستگی سے کھل کر بند ہو گئے۔

''ہم جب چاہیں گے، مل لیا کریں گے۔ ویک اینڈ پر تم میرے پاس آ جایا کرنا۔ ہم سب پر یہی ظاہر کریں گے کہ تم میری دور کی کزن ہو۔ ہمارے والدین کے درمیان کسی جھگڑے کی وجہ سے کئی برسوں سے میل جول بند تھا لیکن اب تمہارے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو گئی ہے اس لیے ناراضی خود بخود ختم ہو گئی ہے اور تم ہم سے ملنے لگی ہو۔ آہستہ آہستہ میرے دوست اور جاننے والے تمہیں پہچاننے لگیں گے۔ ہمیں گھر میں یا باہر ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔''

''تمہارے ڈیڈی کو تو پھر بھی پتا چل سکتا ہے۔''

''ہاں پتا تو انہیں چل ہی جائے گا۔ میں کہہ دوں گا کہ تم میری دوست ہو۔ بس انہیں یہ معلوم نہ ہو.....'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''ایک بہت خاص بات جاشیہ.....'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''تم خود کو مسلم ظاہر نہیں کرو گی۔ تمہیں کرسچن بن کر رہنا ہوگا۔''

اس کا منہ کھل گیا۔ ''میں یہ کیسے کروں گی؟ نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔

''تم سچ مچ کرسچن تو نہیں ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے میری کزن مسلم تو نہیں ہو سکتی۔''

''تمہاری کزن مسلم نہیں ہو سکتی، دوست تو ہو سکتی ہے ناں، کزن والی بات کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

''تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ مسلم لڑکی کرسچن لڑکے کی دوست ہوگی تو لوگوں کو اعتراض ہوگا۔ ہم آزادی سے مل نہیں سکیں گے۔ تم میرے گھر آؤ گی۔ لوگ دیکھیں گے، کوئی متعصب ملا اٹھ کر میرے گھر کو آگ لگا دے گا۔ تمہیں لعنت ملامت کیا جائے گا، نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ تمہیں صورتحال کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔'' وہ مطمئن نہیں ہو سکی لیکن خاموش ہو گئی۔

''میں نے تو تمہاری خاطر اپنا مذہب تک چھوڑ دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی میری محبت کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟'' اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولا۔

جاشیہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ''مجھے کرسچن بن کر ہی رہنا ہے تو کزن کیوں بیوی کیوں نہیں۔''

اونیل نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی ناسمجھی سے عاجز آ گیا ہو۔

''بات وہیں آ کر رک جاتی ہے۔ ڈیڈی میری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں فی الحال انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بار ریسٹورنٹ مکمل ہو جائے پھر ہمیں کسی کی خفگی سے مطلب نہیں ہوگا..... تمہارا نام کیا رکھا جائے؟''

''نام بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ کرسچن لڑکیوں کے نام بھی ایسے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے مسلم لڑکیوں جیسے۔ سائرہ، فاطمہ وغیرہ۔''

''نہیں......'' اونیل نے اسٹیرنگ کو انگلیوں سے بجایا۔'' نام ایسا ہونا چاہیے جسے سن کر لگے کہ تم کرسچن ہو......ایگنس یا جولیا، اینجلا......'' اس نے جاشیہ کے ستے ہوئے چہرے پر نظریں جمائیں۔ ''میری کیسا رہے گا؟''

اس نے بے جان انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

✠ ✠ ✠

اونیل کا گھر قدیم اور جدید طرز تعمیر کا امتزاج تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ گھر بڑا ہوگا اور خوبصورت بھی۔ لیکن اس قدر خوبصورت ہوگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ کسی قدیم حویلی اور جدید بنگلے کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ عمارت کے دونوں اطراف میں مرغول دار برآمدے تھے جنہیں بلند ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ سنگ سرخ کی پیچواں سیڑھیاں بالائی منزل کے شکم سے وسیع لان میں اترتی تھیں۔ وسط میں سنگین روش کے ساتھ ساتھ گل بکاؤلی کے پودے، کیسو اور زینیا کے تختے تھے، عشق پیچاں نے پوربی دیوار کے سینے سے لپٹ کر اسے سبز چادر اڑھا رکھی تھی۔ لان کے ایک گوشے میں مختصر سوئمنگ پول تھا۔ جس کے گرد چندنا اور مور پنکھ کے پودے گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ پورٹیکو کے سرخ چھجے پر شہد آشام کی بیل بچھی ہوئی تھی۔ اونیل کے بیڈروم کی کھڑکی کے ساتھ ایک فلیم ٹری ایستادہ تھا۔ پھولوں کا موسم ابھی دور تھا، لیکن اسے معلوم تھا کہ فلیم ٹری پر جب دہکتے انگاروں جیسے پھولوں کے جھرمٹ اترتے ہیں تو وہ کیسا انوکھا نظر آتا ہے۔

روانگی سے پہلے اونیل نے اسے ڈھیروں شاپنگ کروائی تھی۔ اس کے لیے تمام لباس اس نے خود پسند کیے تھے۔ اسے بوتیکس سے خریداری کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اونیل نے جو بھی منتخب کیا وہ تائید کرتی گئی۔ ایک اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ اونیل کو گہرے رنگ اچھے لگتے تھے۔ اس کے لیے خریدے گئے سارے کپڑوں میں یہ خصوصیت مشترک تھی۔

اسے گھر دکھانے کے بعد اونیل نے سوٹ کیس میں سے ایک سیاہ ساڑھی نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔

''یہ پہن کر آؤ۔ لیکن جلدی، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' سر کے نیچے ہاتھوں کا تکیہ بناتے ہوئے وہ دراز ہو گیا۔

''یہ تو شاید گرمیوں میں پہننے کے لیے ہے۔'' اس نے بے آستین کے مختصر بلاؤز کو دیکھ کر کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''سردی گرمی کا تو سوال ہی نہیں۔ ہم کہیں باہر نہیں جا رہے، یہ صرف میرے لیے پہنو گی تم۔ جلدی آ جاؤ۔ میں تمہیں اس ساڑھی میں دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔''

وہ ایک طویل سانس بھر کر باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئی تو اونیل کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔

سنگ مرمر سے تراشی ہوئی بانہیں پہلوؤں میں بل کھا رہی تھیں۔ ڈھول پر مڑھے چمڑے جیسا تنا ہوا چلو بھر پیٹ جس کی لشک مہین سیاہ کپڑا چھپانے میں ناکام تھا۔ گھنے سیاہ بال دودھیا شانوں پر ایسے جھکے تھے جیسے بادام کے شگوفوں بھرے باغات پر ابر نیساں منڈلاتا ہو۔ لجائی ہوئی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

بہت دیر تک اونیل کچھ بول نہیں سکا۔ ''مجھے اس لمحے پر اعتبار نہیں آتا۔ تم اتنی خوب صورت ہو کہ اس زمین کی لگتی ہی نہیں ہو۔ میرے پاس آ جاؤ، میں تمہیں چھو کر خود کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔''

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر اونیل نے اسے پہلو میں بٹھا لیا تھا۔

اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ بوجھل پلکیں گالوں سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

اونیل اس کی تعریف کر رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔

سارا کمرہ اونیل کے وجود سے بھر گیا تھا۔ دیواروں پر اس کی آنکھیں رینگ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے ان گنت عکس در و بام پر بکھرنے لگے تھے۔ ہوا میں اس کی سرگوشیاں تیر رہی تھیں۔ اس کی مہک سانسوں میں گھلی جاتی تھی۔ جاشیہ کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی ایسے بیت العنکبوت میں الجھ گئی تھی، جس کے لچکیلے تار خوشبو سے بنے ہوئے تھے۔ وہ چندن کے جنگل میں تھی۔ خوشبو کے گرداب میں پھنسی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اونیل کے سوا وہ سب بھول گئی تھی۔ وہ ایک پجارن تھی جو دیوتا کے سامنے سیس نوائے بیٹھی تھی۔

✠ ✠ ✠

اس بار ویک اینڈ پر جب وہ کنگن پور گئی تھی تو ابا نے اسے گرم کپڑے خریدنے کے لیے کچھ پیسے دیے تھے۔ صدف سے ساتھ چلنے کو کہا تو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ رضامند ہو گئی۔ اسے بھی چند چیزیں خریدنا تھیں۔ چھٹی والے دن وہ دونوں مطلوبہ اشیاء کی فہرست بنا کر بازار چلی گئیں۔

موسم بدل رہا تھا، دھوپ کی پہلے والی تندی برقرار نہیں رہی تھی۔ صبح اور شام کے وقت ہوا میں خفیف سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ چارپائیاں جو رات کو برآمدے میں ایئر کولر کے سامنے بچھائی جاتی تھیں، اب کمروں میں منتقل ہو گئی تھیں۔ اور چھتوں کے پنکھے دھیمی رفتار سے گھومتے تھے۔

وہ دس بجے گھر سے نکلی تھیں اور بازار میں چکراتے چکراتے ایک بجنے والا تھا لیکن ہوا میں تپش نہیں تھی۔ تھکن بھی کوئی خاص محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم عائشہ آج کے تجربے سے بددل ہو گئی تھی۔ صدف کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے وہ مسلسل خوف میں مبتلا تھی۔ کوئی ایک چھوٹی سی چیز پسند کرتے ہوئے وہ دس دکانوں پر بھٹکتی اور قیمت پر دکانداروں سے اتنے سخت الفاظ میں بحث کرتی کہ عائشہ کو خطرہ محسوس ہونے لگتا کہ دکاندار انہیں دھکے دے کر نکال دے گا۔ لیکن صدف دکاندار کی خشمگیں نظروں کو خاطر میں لائے بنا قیمت پر جھگڑے جاتی اور اس کے بتائے ہوئے پیسوں سے ایک روپیہ بھی زائد طلب کیا جاتا تو چیز دکاندار کے منہ پر مار کر پیر پٹختی ہوئی وہاں سے اٹھ آتی۔

نیلی ٹائلوں سے بنے ہوئے گول فوارے کے قریب جو گرد کی جمی ہوئی تہوں اور ارد گرد ریڑھیوں، ٹھیلوں کے جمگھٹے کے باعث میلا اور کسی حد تک بدہیئت دکھائی دیتا تھا، صدف ایک ریڑھی والے سے سیبوں کی قیمت پر جھگڑا کر رہی تھی اور عائشہ اس سے خاصی دور یوں کھڑی تھی جیسے اس کے ساتھ نہ ہو۔ شال اور گرم کپڑوں والے شاپروں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا تو وہ مڑی۔ آنکھوں پر سیاہ گاگلز لگائے، کھلے بالوں کے ساتھ میری اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''بہت شاپنگ کی ہے تم نے، اکیلی آئی ہو؟''

اس کے جواب دینے سے قبل صدف آ گئی۔ وہ بھی میری کو دیکھ چکی تھی اور اسی لیے

بحث ملتوی کر کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ چپکائے آ گئی تھی۔

''آپ کی گاڑی کہاں ہے؟'' صدف نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔

''میں تو رکشے پر آئی ہوں۔ گاڑی ابھی کہاں چلانی آتی ہے مجھے۔ اونیل سے سیکھ رہی ہوں۔ شاید جلد ہی تم لوگ بازار آنے جانے کے لیے میری خدمات سے استفادہ کرو۔''

''اچھا میں تو سمجھی آپ اونیل بھائی کے ساتھ ہوں گی۔'' صدف کو مایوسی ہوئی۔ بس اسٹاپ تک لفٹ ملنے کی امید دم توڑ گئی تھی۔

''میں ریسٹورنٹ تک جا رہی تھی۔ تم لوگوں کو دیکھ کر یہیں رکشہ چھوڑ دیا۔ چلو تم دونوں بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ لنچ کا وقت ہو رہا ہے۔ ریسٹورنٹ میں ایک نئی ڈش انٹروڈیوس کروائی گئی ہے۔ شوارما، خاصی مزیدار قسم کی چیز ہے۔ آج اسے ٹرائی کر کے دیکھو۔ مجھے تو بہت پسند ہے۔''

''یہ شوارما ہوتا کیا ہے؟'' صدف نے دلچسپی ظاہر کی۔

''یہ تو مجھے بھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں بس یوں سمجھ لو کہ زیادہ کھٹائی کریم اور سلاد کی ساتھ ایک طرح کا چکن برگر.....'' اس نے مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

عائشہ اس سارے ذکر سے لاتعلق کھڑی بار بار چادر درست کرنے میں مصروف تھی۔

''تمہارا کیا پروگرام ہے عائشہ! چلو گی۔'' میری نے اس سے پوچھا تو وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی۔

''نہیں جی..... میں تو..... ہمیں بڑی دیر ہو گئی ہے گھر سے نکلے ہوئے۔''

''پلیز بھئی چلو عائشہ، تم نے تو میرے کزن کا ریسٹورنٹ دیکھا ہی نہیں۔ بڑی شاندار جگہ ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں تم وہاں کے ماحول اور کھانے کو انجوائے کرو گی۔''

''ابھی جا کر مجھے کھانا بھی بنانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ رہنے دیں جی۔''

''تم ہی کہو عائشہ سے، شاید تمہاری بات مان جائے۔'' اسے گریزاں دیکھ کر وہ صدف سے مخاطب ہوئی۔

''میں کیا کہوں عائشہ کی مرضی ہے۔'' صدف نے انکار کرنے کے بجائے بات اس پر ڈال دی تھی۔

''یہاں سے بالکل نزدیک ہے۔ کوئی زیادہ چلنا نہیں پڑے گا۔ اور میں اونیل سے کہہ

دوں گی، وہ تم لوگوں کو بس اسٹاپ تک چھوڑ آئے گا۔ عائشہ! تم تو منتیں کروا رہی ہو۔'' میری نے لہجے میں ناراضی سمو کر کہا تھا۔

اس نے مدطلب نظروں سے صدف کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف دیکھ ہی کب رہی تھی جو اس کی کوئی مدد کرتی۔

''اتنا اصرار کر رہی ہیں، تو مان جاؤ عائشہ۔ اس طرح بیچ بازار کھڑے ہم کیا اچھے لگ رہے ہیں۔''

''ہمیں دیر ہو جائے گی۔ میں تو ہوٹل کا کھانا کھاتی ہی نہیں۔'' اس نے ایک اور کوشش کر دیکھی۔

''ہم بس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جائیں گی۔ دیر کیسی؟ شاپنگ کرتے ہوئے تو صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں۔'' اس سے نظریں ملائے بنا صدف بولی۔

''وہ کوئی ایسا ویسا ہوٹل نہیں ہے بلکہ میرا دعوا ہے کہ تم ایک بار وہاں کا کھانا کھا کر بار بار جانے کی خواہش کرو گی۔'' میری ایک خالی رکشے کو آتے دیکھ کر رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ ''رکشے پر ہی چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ پیدل جانے والا آئیڈیا منسوخ کر دیتے ہیں۔''

ان مانے جی سے عائشہ ان کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گئی۔ اسے صدف کا فوراً دعوت قبول کر لینا اچھا نہیں لگا تھا۔

ریسٹورنٹ واقعی میری کے بیان کردہ خاکے کے عین مطابق تھا۔ جدت کے سب ہتھیاروں سے لیس ایک نمائش کدہ۔ شہر کے بے فکرے امراء، قیمتی فرنیچر پر براجمان نفیس کراکری کے انبار سامنے رکھے۔ متفرق رنگوں کے مشروبات سجائے خوش گپیوں میں محو تھے۔

ان میں سے بہت کم تھے جنہیں بھوک مٹانے سے دلچسپی تھی۔ نخوت سے لقمہ توڑتی انگلیاں اور غرور سے لتھڑے، کھلتے بند ہوتے ہونٹ کھانے پینے سے شغف نہ رکھتے تھے۔ انہیں اپنی دولت اور مرتبے کا اظہار مقصود تھا۔

فضا میں ایک بے عنوان سی گھٹن تھی جسے عائشہ شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس اجنبی ماحول میں اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔

چکنے، چمک دار فرش پر قدم نہیں جمتے تھے، پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ سنگلاخ دیواروں میں بے شمار آئینے چنے گئے تھے۔ ہر عکس ایک بت تھا۔ لوگ اپنی شبیہوں کو پوج رہے تھے۔ خود پرستی کے پیروکار اپنے دین کا پرچار کر رہے تھے۔

میری نے انہیں ایک خالی ٹیبل پر بٹھا دیا تھا۔ یہاں کے ملازمین اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ یقیناً وہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ ایک باوردی ویٹر سے مشروبات لانے کے لیے کہہ کر وہ انہیں ریسٹورنٹ کے متعلق بتانے لگی۔

''شام کو یہاں آنے کا اپنا ہی لطف ہے۔ لان میں باربی کیو کا انتظام ہوتا ہے۔ فیملیز بھی عموماً اسی وقت آتی ہیں۔ اب تو زیادہ تر مرد حضرات ہی نظر آ رہے ہیں۔ خوبصورت ملبوسات کا مقابلہ اور میک اپ ٹیکنیکس پر مباحثے یہاں رات کے وقت ہوتے ہیں۔''

صدف ہنسی۔ ''خیر محفل تو اس وقت بھی پھیکی نہیں ہے۔ بڑے رنگ نظر آ رہے ہیں۔ ذرا اپنے پیچھے ایک نظر ڈالیے۔''

میری نے گردن موڑ کر دیکھا چبھتے ہوئے قرمزی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون میں ملبوس، گورا چٹا، خوش شکل نوجوان جس کے ایک کان میں بالی تھی اور گلے میں موٹی طلائی زنجیر، ہونٹوں میں سگریٹ دبائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ان ہی کی جانب متوجہ تھا۔

میری نے قہقہہ لگایا۔ ''جوائس کی داد دینی پڑے گی۔ ایسا رنگ منتخب کیا ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ماننا پڑے گا۔ اس پورے ڈائننگ ہال میں یہ بندہ سب سے نمایاں ہے۔''

میزوں کے درمیان اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ وہ لڑکا میری کا تبصرہ نہ سن پاتا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے اضطراب کو بھانپ کر وہ دونوں کھلکھلا رہی تھیں۔ کہ اونیل تین لڑکوں کو ساتھ لیے آ گیا۔ عائشہ کے اعصاب تن گئے، وہی جسم کو چھیدتی ہوئی نگاہیں اسے گھیرے میں لے چکی تھیں۔ اونیل اس کے عین سامنے کرسی پر جم گیا۔ میری ان لڑکوں کا تعارف کروا رہی تھی۔

''یہ شیراز ہیں، اونیل کے دوست، یہ عمانوئیل ہیں انہیں بھی دوست ہی سمجھو۔ کبھی کبھی دشمنی بھی کر جاتے ہیں۔'' اس کے کہنے پر عمانوئیل مسکرا دیا تھا۔ ''اور یہ جو خوامخواہ مسکرائے جا رہے ہیں ان کا نام کاشف ہے۔ یہ نہ تو دوست ہیں نہ دشمن، البتہ ان سے تھوڑے بہت مراسم ضرور ہیں۔

میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا اونیل؟'' اس نے اونیل کی تائید چاہی۔

اسی دم ویٹر نے مشروبات لا کر میز پر رکھ دیے۔ اونیل نے اسے اور ڈرنکس لانے کی ہدایت کی تھی۔

عائشہ کی نظریں میز کی سطح سے فرش پر اور فرش سے لوگوں کے جوتوں میں بھٹک رہی تھیں۔ اس کا جی اٹھ کر بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن صدف اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اونیل اور اس کے ساتھ آئے ہوئے لڑکوں کے رسمی سوالوں کے مفصل جواب دینے میں مشغول تھی۔

''آپ کی فرینڈ بہت خاموش ہیں، شاید ہماری آمد انہیں اچھی نہیں لگی۔'' اونیل نے ارغوانی رنگت کے چمکیلے مشروب کا گلاس عائشہ کے قریب کھسکایا اور براہ راست اسے مخاطب کر کے بولا۔ ''یہ ہمارے ریسٹورنٹ کا سب سے عمدہ مشروب ہے۔ میں آپ کے کمنٹس سننا چاہتا ہوں۔''

اس کا ہاتھ سختی سے میز کے کنارے پر جم گیا۔ نظریں اٹھائے بغیر بھی اسے احساس تھا کہ سب اسی کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دم وہ کرسی سے اٹھ گئی۔

''صدف! چلو بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا عائشہ؟'' میری نے حیرت سے پوچھا۔ ''ابھی تو دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہمیں آئے ہوئے۔''

''نہیں جی، تائی جان ناراض ہوں گی۔ کل رات سے ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔'' کرسی کھسکا کر وہ چل پڑی۔

صدف کو اس کی حرکت پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ لیکن اٹھے بغیر چارہ نہیں تھا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ان لوگوں سے معذرت کر کے وہ اٹھ گئی تھی۔

اونیل کو نہ جانے کیا ہوا، وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا عائشہ کے قریب پہنچ گیا۔

''یہ تو آپ اچھا نہیں کر رہیں مس عائشہ! کچھ دیر ہمیں کمپنی دے دیتیں تو ہم اسے خوش نصیبی تصور کرتے۔ چلیے واپس اپنی نشست سنبھالیے، کھانا کھائے بغیر آپ کو جانے نہیں دیا جائے گا۔''

لجاجت سے بولتا ہوا وہ اس کے سامنے آ گیا، بہت سی گردنیں ان کی جانب مڑ گئی تھیں۔

عائشہ نے اس کے چمک دار جوتوں کو دیکھتے ہوئے رخ تبدیل کیا اور اس کے قریب سے گزر گئی۔

''اس طرح اٹھ کر جانا آداب کے خلاف ہے، آپ کو.....'' الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اونیل کا پاؤں ایک کرسی میں الجھ گیا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کے باوجود وہ دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ کرسی کا سہارا لینے کی کوشش میں اس کا ہاتھ میز پر رکھے کانچ کے جگ سے ٹکرایا تھا اور جگ فرش پر گر کر کرچیوں میں بٹ گیا تھا۔ اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگ ہنس رہے تھے۔ دبے دبے قہقہے ہوا میں بھنبھنانے لگے تھے۔ عائشہ نے اس کے خجالت سے سرخ چہرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر گلاس ڈور دھکیلا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ اونیل کی آنکھوں میں جو کیفیت نظر آئی تھی، وہ اس پر بدحواسی طاری کر رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

اونیل نے اسے کالج میں ایڈمیشن دلا دیا تھا۔ اس کے تمام ڈاکومنٹس پر نام کے خانے میں میری ولیمز درج تھا۔ نئے نام سے مانوس ہونے میں اسے بہت دن لگ گئے تھے، شروع شروع میں جب کوئی اسے میری کہہ کر پکارتا تو وہ بے دھیان بیٹھی رہتی۔ دوسری یا تیسری پکار پر چونک کر متوجہ ہوتی۔

ہاسٹل میں چار لڑکیاں ایک کمرہ شیئر کرتی تھیں لیکن اونیل نے اپنے تعلقات کے بل بوتے پر اسے ایک الگ کمرہ لے دیا تھا۔ اس کے کمرے کی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اونیل نے اس کے ایک کمرے کو سجانے کے لیے اتنا پیسہ خرچ کیا تھا کہ شاید ان کے پورے گھر میں اتنی مالیت کا سامان نہیں ہوگا۔ اس کے پاس اتنے لباس تھے کہ روزانہ نیا لباس پہنتی تو بھی مہینوں کسی لباس کو دوبارہ پہننے کی نوبت نہیں آتی۔ اسے جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی، اونیل بنا کسی پوچھ گچھ کے اس کے حوالے کر دیتا۔ وہ نہ بھی مانگتی تو کچھ دنوں کے وقفے سے وہ اچھی خاصی رقم اسے دے دیتا۔ وارڈن اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتی تھی۔ اگر وہ کبھی پوری رات بھی ہاسٹل سے غائب رہتی تو اس کے ماتھے پر بل نہ پڑتا۔

کچھ ہی عرصے میں لڑکیاں اس سے مرعوب ہوگئی تھیں۔ اس کا پہناوا، شخصیت کی تمکنت

اور امارت لڑکیوں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کا موجب تھی۔ مختلف حیلے بہانوں سے لڑکیاں اس کے کمرے میں آن بیٹھتیں۔ اس کے ساتھ دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتیں۔ اس نے کبھی کسی کو اپنے کمرے میں آنے سے منع نہیں کیا تھا، لیکن سب سے ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھا تھا۔

اونیل اسے ملنے کے لیے آتا تو لڑکیاں رشک اور حسد میں ڈوب کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔ چہ میگوئیاں ہوتیں، اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر سرگوشیوں میں باتیں کی جاتیں۔ اونیل کے قدموں سے قدم ملا کر چلتے ہوئے وہ خود کو کسی عظیم الشان سلطنت کی ملکہ تصور کرنے لگتی۔ اونیل کی وارفتگیاں، اس کی چاہت، اس کے جسم میں دوڑتے خون کو پارے میں ڈھال دیتی۔ وہ گویا ہوا میں تیرنے پر قادر ہوگئی تھی۔ اتنی آسائشیں، ایسی اہمیت اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں پائی تھی۔ وہ بالکل اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ جس سے تتلی کا پہلا روپ تب روشناس ہوتا ہے جب اس کے پر نکل آتے ہیں۔ جب وہ ایک حقیر کیڑے سے لمبی اڑانیں بھرنے کی اہل خوش رنگ پروں والی تتلی میں ڈھل جاتا ہے۔ جاشیہ کو لگا جیسے آسمان اس کے قدموں میں آ گیا ہو۔

پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ کتابیں کھول کر بیٹھتی تو اوراق کورے ہو جاتے۔ ان پر اونیل کی آنکھیں، اس کے ہونٹ مرتسم ہونے لگتے۔ لیکچر سنتے ہوئے بار بار اس کا دھیان اونیل کی طرف چلا جاتا۔ ٹیچر اس کی بے توجہی پر ڈانٹتیں تو وہ محض مسکرا کر رہ جاتی۔

ہر تیسرے چوتھے دن وہ کالج سے چھٹی کر کے اس سے ملنے پہنچ جاتی، لڑکیوں میں اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ اس کے رشتے دار کینٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ اور وہ ان کے ہاں جاتی ہے۔ اس کہانی پر آسانی سے یقین بھی کر لیا گیا تھا، کیونکہ اونیل جب کبھی اس سے ملنے آتا تو چار لڑکیوں کے درمیان فرضی انکل یا آنٹی کا تذکرہ چھیڑ دیتا۔ ریسٹورنٹ تو وہ تقریباً روز ہی جاتی تھی۔ اونیل موجود نہ ہوتا تو وہ اس کے بے تکلف دوستوں، شیراز عمانوئیل وغیرہ کے ساتھ گپ شپ کر کے وقت گزار لیتی۔

وقت بتانا اس کے لیے یوں بھی دشوار تھا کہ کالج میں اس کی دوستی کسی لڑکی سے نہیں تھی۔ تھوڑے بہت مراسم تو اس کے اپنی تمام کلاس فیلوز اور جونیر کلاس کی چند لڑکیوں سے تھے۔ لیکن اس نے ایک خاص حد مقرر کر رکھی تھی اور کسی بھی لڑکی کو اس مقررہ حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

عائشہ وہ پہلی لڑکی تھی جس سے پہلی بار ملتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس سے دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ عجیب ڈرپوک اور بے ضرر قسم کی لڑکی تھی۔ سہمی ہوئی سی، بہت کم گو۔ سارے دن میں وہ اتنے جملے بولتی کہ جاشیہ چاہتی تو با آسانی گن سکتی تھی۔ جہاں کہیں لمبے چوڑے دلائل اور طویل بحث کی ضرورت ہوتی، وہ ایک آدھ فقرہ بول کر کام چلا لیتی۔ جہاں قہقہے درکار ہوتے وہ مبہم سا مسکرا دیتی۔ شکل پر اتنی معصومیت تھی کہ خوامخواہ پیار آ جاتا تھا۔ کستورے کے چمکیلے پروں جیسی بڑی بڑی کالی آنکھیں جن سے ہر دم سیاہ شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ چھوٹی سی ناک جس کی ساخت میں ایسی عمدگی تھی کہ کسی سنگ تراش کی برسوں کی ریاضت لگتی تھی، گلابی گداز ہونٹ، مختصر دہانہ، رنگت ناریل کے گودے جیسی شفاف اور اجلی تھی۔ بال بہت دراز تھے۔ شاید گھٹنوں تک یا ان سے کچھ نیچے جاشیہ کبھی بھی ان کی صحیح لمبائی نہیں جان سکی تھی۔

عائشہ ایک بے ڈھنگی سی چٹیا بنا کر دوپٹے سے چھپائے رکھتی، خود سے حد درجہ لاپروا تھی۔ جاشیہ نے دوسری لڑکیوں کی طرح کبھی اسے اپنی جلد کے لیے، خوبصورتی کے لیے پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا، خود کو بنانے سنوارنے کا تردد وہ کبھی نہیں کرتی تھی۔ خود کو دکھانے کا، نمایاں کرنے کا شوق اسے ہرگز نہیں تھا۔ اس کے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے۔ وہ اپنے تایا کے گھر رہ رہی تھی۔

روزانہ کالج آنے اور واپس جانے کے لیے اسے تانگوں اور بسوں کے دھکے کھانے پڑتے۔ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ جاشیہ نے اسے کینٹین سے کبھی کچھ خرید کر کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ کئی دفعہ تانگے کا کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ تین کلومیٹر پیدل چل کر بس اسٹاپ تک جاتی۔ اس کا یونیفارم معمولی کپڑے کا تھا۔ اور پیروں میں ہمیشہ ایک بھدی سی جوتی ہوتی۔ کالج بیگ کے نام پر موٹے کپڑے کا سلا ہوا تھیلا کندھے سے لٹکائے پھرتی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جاشیہ نے اس کی زبان سے کبھی شکوہ نہیں سنا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے مکمل اطمینان ظاہر ہوتا۔ اللہ نے اسے بہت ساری چیزوں سے محروم کر رکھا تھا۔ مگر وہ ہر دم اس کے گن گاتی نظر آتی۔ سرتاپا اس کی محبت میں ڈوبی رہتی۔ اذان کی آواز سنتے ہی سیدھی ہو کر بیٹھ جاتی۔ اردگرد بیٹھے لوگوں سے بالکل لاتعلق ہو جاتی۔

کئی بار اسے شک گزرتا کہ وہ سارا دن نماز کے وقت کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ پورے دن میں واحد وقت جب اس کے چہرے پر واضح مسکراہٹ نظر آتی، نماز کا وقت تھا۔ اس نے کبھی کسی کو اتنی خوشی سے نماز ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ زمین پر گرا ہوا کاغذ کا کوئی ٹکڑا دیکھ کر وہ فوراً اسے اٹھاتی اور اچھی طرح دیکھ کر کسی شاخ یا دیوار کی کسی درز میں اٹکا دیتی۔

کئی بار وہ کاغذ اپنے بیگ میں بھی ڈال لیتی تھی۔ پہلے پہل جاشیہ اس کی اس عادت سے سخت نالاں ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ اسے عادت ہو گئی۔ ایک دو دفعہ پوچھنے پر عائشہ نے کہا تھا۔ ''اللہ رسول کا نام نہ لکھا ہو کہیں۔''

اسے عائشہ سے ایک طرح سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ دکھی نہیں تھی اور اسے ہمدردی کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی جاشیہ کو لگتا جیسے وہ محروم اور قابل رحم ہو۔ وہ عائشہ سے اپنا موازنہ کرتی تو ہر لحاظ سے خود کو برتر پاتی۔ عائشہ کے پاس اعتماد تھا، نہ دولت، نہ اہمیت اور، شاید محبت بھی میسر نہیں تھی۔ وہ اسی جگہ شادی کرنے پر رضامند تھی جہاں اس کے والدین چاہتے، جبکہ جاشیہ کے پاس یہ سب چیزیں تھیں اور وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی۔

عائشہ کالج کی کسی تقریب میں شرکت کرنے کی ہامی نہ بھرتی، کہیں باہر جانے کے لیے تیار نہ ہوتی۔ اور تو اور کئی دفعہ وہ ہاسٹل میں اس کے کمرے تک جانے کے لیے آمادہ نہ ہوتی۔ پتا نہیں یہ اس کی تنہائی پسندی تھی یا احتیاط یا شاید وہ احساس کمتری کے باعث ایسی محفلوں میں شامل ہونے سے احتراز برتتی تھی، ایک روز وہ عائشہ اور اس کی کزن صدف کو اپنے ساتھ اونیل کے ریسٹورنٹ لے گئی۔ وہاں پر عائشہ نے اتنا عجیب رویہ ظاہر کیا کہ وہ حیران رہ گئی۔ نہایت بدتہذیبی دکھاتے ہوئے وہ اچانک اٹھ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اونیل نے از راہ اخلاق اسے روکنا چاہا لیکن وہ کچھ کہے سنے بغیر چلی گئی۔

بڑی بدمزگی ہوئی تھی۔ اسے روکتے ہوئے اونیل سب کے سامنے گر گیا اور اس کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ شیراز نے مذاق میں ایک چھوٹا سا فقرہ اچھال دیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا، اتنے غصے میں اس نے اونیل کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لنچ کرنے کے ارادے سے آئی تھی مگر عائشہ کی وجہ سے سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔ اونیل نے اسے فوراً ہی ہاسٹل چھوڑ دیا تھا راستے میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔

وہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات اس کے منہ سے نہ نکل جائے جو اونیل کو مزید ناراض کر دے۔

پھر شام کو وہ خود ہی اسے لینے آ گیا۔ اس کا موڈ ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ اسے ایک کنسرٹ میں لے جا رہا تھا۔ جاشیہ نے جان بوجھ کر دوپہر کے واقعہ کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن باتوں کے دوران خود اونیل نے وہ بات شروع کر دی۔ عائشہ کی حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''چادروں میں لپٹی ہوئی لڑکیوں میں بڑا گند چھپا ہوتا ہے۔ اس طرح پہلو تہی کر کے ثابت کرتی ہیں کہ ہم بہت منفرد ہیں۔ خود کو کوئی خاص چیز بنا کر پیش کرتی ہیں۔ یہ پردے وغیرہ کا اہتمام نمایاں ہونے کا ایک طریقہ ہے۔ اس طرح پوشیدہ ہو کر وہ خود کو مزید ننگا کر دیتی ہیں، نظروں کو مجبور کرتی ہیں کہ ان کی طرف اٹھیں، دلوں میں تجسس ابھارتی ہیں۔ ان کا گریز ڈھونگ ہوتا ہے۔ مردوں کو لبھانے کا ذرا مختلف ڈھنگ ہے یہ۔ ان کی ہوس دوسری لڑکیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ شریف زادیاں..... ہونہہ مائی فٹ۔''

اس نے نفرت سے کہا۔

''عائشہ تو بے وقوف سی ہے۔ پتا نہیں کیوں اس نے اس طرح بی ہیو کیا۔'' اسے اونیل کے اتنے سخت الفاظ پر اعتراض تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں معلوم، تم کیا جانو ایسی لڑکیوں کے ہتھکنڈوں کو، اوپر اوپر سے شرم و حیا اور اندر گندگی ہی گندگی۔ ذرا سا جو موقع مل جائے تو کسی بھی حد تک گر جاتی ہیں۔ ایسی بہت سی نیک بیبیوں کی شرافت سے واقف ہوں میں نقاب میں منہ چھپائے اجنبیوں کے ساتھ لمبی کاروں میں بیٹھ کر جانے والی بہت دیکھی ہیں میں نے موری کے کیڑوں جیسی ہوتی ہیں یہ۔'' وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔

جاشیہ نے خاموش ہو جانا بہتر سمجھا، عائشہ کی وکالت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اونیل کا غصہ بجا تھا۔ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔

اگلے روز وہ عائشہ کو پورے کالج میں ڈھونڈتی پھری لیکن اسے تلاش نہیں کر پائی۔ صدف سے اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ وہ کالج آئی ہوئی تھی، لیکن نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔ وہ ہر اس جگہ گئی جہاں اس کی موجودگی کا امکان تھا مگر وہ کہیں بھی نہ ملی۔ اس کے دو ضروری نوعیت کے ٹیسٹ

تھے۔ اس لیے وہ کلاسز میں جا کر اسے نہیں دیکھ سکی۔ فارغ پیریڈ میں عائشہ اس سے انگلش میں مدد لیا کرتی تھی۔ اس روز وہ اس کام کے لیے بھی نہیں آئی، وہ یہی سوچتی رہی کہ شاید آج کوئی بھی پیریڈ فری نہیں ہوگا۔ لیکن کم از کم وقفہ کے دوران تو اسے آنا چاہیے تھا۔

چھٹی کے وقت اس کے ذہن میں مسجد کا خیال آیا تو وہ مسجد کے سامنے پہنچ گئی۔ نماز پڑھ کر نکلنے والی لڑکیوں میں عائشہ بھی تھی، اس پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹکی اور واپس اندر چلی گئی۔ جاشیہ کو بہت دکھ ہوا تھا، اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ عائشہ اسے دیکھ کر اندر گئی تھی۔ کچھ دیر کھڑی وہ اس کے نکلنے کی منتظر رہی لیکن وہ باہر نہیں آئی، ایک بار اس کا جی چاہا کہ مسجد کے اندر جا کر اس گریز کی وجہ دریافت کرے۔ مگر اس ارادے پر عمل نہیں کر سکی، بوجھل دل کے ساتھ وہ ہاسٹل کی طرف جانے والی روش پر چل دی تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ سب کے ساتھ رات کا کھانا کھانے بیٹھی تھی۔ عجی اس کے بنائے ہوئے پالک گوشت کی تعریف کر رہا تھا۔ جب صدف نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر دوپہر والی بات چھیڑ دی تھی۔

''امی آج بڑا تماشا ہوا، بازار میں ہمیں ''میری'' مل گئی تھی۔ وہ جو اس دن ہمارے گھر بھی آئی تھی۔ عائشہ کی سہیلی ہے۔''

تائی جان نے یوں سر ہلایا جیسے میری کے متعلق یاد آ گیا ہو۔ عائشہ کو یہ تمہید کسی خطرے کا پیش خیمہ لگی تھی۔ اس کی بھوک اڑ گئی۔

''وہ ہمیں لے کر چلی گئی ریسٹورنٹ کھانا کھلانے کے لیے۔ اس کے کزن کا ریسٹورنٹ ہے ادھر اوکاڑہ شہر میں۔ میں تو جانا نہیں چاہتی تھی، لیکن جہاں دو سہیلیوں کی مرضی ایک ہو۔ وہاں میری رائے کی کیا اہمیت تھی۔ ریسٹورنٹ میں میری کا کزن اونیل اور اس کے دوست مل گئے۔ لو جی۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی بے تکلفی سے ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیں گے۔ امیر لوگ ہیں۔ مرد عورتیں اس طرح گھل مل کر بیٹھنے کو برا نہیں سمجھتے، عائشہ کو کئی بار اٹھنے کا اشارہ کیا پر یہ تو ایسی باتوں میں لگی تھی کہ جانے کا دھیان ہی نہیں دیا۔

اس کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ صدف بات کو کوئی اور رنگ دے رہی تھی۔ تائی جان نے بڑا سا لقمہ منہ میں گھسیڑتے ہوئے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ عجی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار کی چغلی کھا رہا تھا۔ تایا جی البتہ پہلے کی طرح سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔

''جتنی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ میری جان ہوا ہوتی رہی۔ یوں اجنبی آدمیوں کے سامنے بیٹھ کر کچھ کھایا پیا جاتا تھا بھلا۔'' صدف، منہ کے ایسے زاویے بنا رہی تھی جیسے کوئی بہت مزیدار بات سنا رہی ہو۔ عائشہ کی انگلیاں مفلوج ہو کر سینی میں دھری تھیں۔ اس نے کمزور آواز میں وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے منع کیا تھا جی۔ پر صدف بولی تھوڑی دیر بیٹھ کر.....''

تائی جان نے ابرو پر گرہ مارتے ہوئے اسے خاموش کر دیا۔ ''پوری بات تو سن لینے دو۔''

''تماشا تو تب ہوا امی! جب اونیل نے بھاگ کر عائشہ کو روکنے کی کوشش کی۔'' صدف نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا تھا۔ ''ہم جانے لگے تو وہ منتیں کرتا ہوا پیچھے آیا کہ کچھ دیر اور بیٹھیں۔ شوار ما کھا کے جایئے گا۔ نئی ڈش ہے۔ نیا ذائقہ ہے فلاں فلاں، کہتے کہتے فرش پر اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ ایک بیرے کے قدموں میں جا گرا۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کا ساتھ کسی نے نہیں دیا تھا۔ لیکن کوئی دھیان دیے بغیر اس نے بات جاری رکھی۔

''سارے لوگ ہنسنے لگے۔ بڑی بے عزتی ہوئی بے چارے کی۔ منہ شرم سے لال ہو گیا۔ آنکھوں میں پانی، نظر اٹھا کر کسی کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ سچی! دیکھنے والی شکل تھی۔ بڑا مہذب بن کر لمبی چوڑی باتیں کر رہا تھا۔ کتنی دیر تو فرش سے اٹھ ہی نہیں سکا۔''

عجی دسترخوان سے ہاتھ پونچھ کر ایک جھٹکے سے اٹھا اور چق ہٹا کر صحن میں چلا گیا۔

''ویسے اس کے ساتھ ہوا بہت اچھا۔ جب کوئی نہیں رکنا چاہتا تو زبردستی روکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' صدف نے کچھ جتانے والے انداز میں اسے مخاطب کیا اور خالی برتن سمیٹنے لگی۔

وہ صدمے سے گنگ اسے دیکھتی رہی۔

تایا جان جھکے ہوئے سر کے ساتھ بولے۔ ''آئندہ میں نے سنوں کہ تم کسی سہیلی کے ساتھ کہیں باہر گئی ہو۔''

''میں نے روکا تھا صدف کو۔''

''ٹھیک ہے، تم نے روکا ہوگا۔ لیکن آئندہ احتیاط کرنا۔'' وہ تنبیہی لہجے میں کہہ کر اٹھ گئے۔

بے بسی کے شدید احساس میں گھر کر اسے رونا آ رہا تھا۔ صدف نے واقعہ اس پیرائے میں بیان کیا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو روٹی کا آخری لقمہ حلق میں اتار کر تائی جان اس کی گوشمالی کے لیے میدان میں اتریں۔

''یہ کیا حرکت کی تم نے؟ تمہارے تایا کا کوئی جاننے والا تمہیں غیر مردوں کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھ لیتا تو کیا خاک عزت رہ جاتی ہماری، خود تم تم چلی ہی گئیں صدف کو کیوں ساتھ لے گئیں، یہ کنگن پور کی ریت ہوگی۔ مردوں کے ساتھ کھل ڈل کے ملنے کی۔ یہاں ایسا رواج نہیں ہے۔ خود کو ذرا قابو میں رکھو۔ شریف بیٹیوں کی طرح نہیں رہا جاتا تو بتاؤ مجھے میں تمہیں ابھی واپس بھجوا دوں۔ تمہاری ذمہ داری اٹھا کر بڑی غلطی کی۔ پتا نہیں اور کیا کیا لچھن دکھاؤ گی۔''

''ایک بار میری بات تو سن لیں۔ مجھ سے بھی تو پوچھ لیں۔'' اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والا گرم پانی چھلکنے کو بے تاب تھا۔

''آنکھیں تو اتنی جلدی بھر لاتی ہے کہ فلموں والیاں بھی پیچھے رہ جاتی ہیں۔ خدا جانے اتنے مکر کہاں سے سیکھے ہیں۔ یہ ذمہ داری ہمیں بڑی مہنگی پڑے گی۔ کوئی چاند چڑھائے بغیر تم نہیں رہو گی۔''

انہوں نے ہوا میں یوں ہاتھ چلایا جیسے اس کے منہ پر طمانچہ مار رہی ہوں۔

وہ چپ چاپ صحن میں آ گئی۔ نیم کی ڈالیوں کی اوٹ سے زعفرانی چاند جھانک رہا تھا، اس کی پھیکی چاندنی دبے پاؤں فرش پر اتر رہی تھی۔ نیم کا پیڑ رہ رہ کر جھرجھری لیتا تھا۔ عجی واش بیسن کے پاس چوکی پر سر کے بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا تھا۔ وہ الٹے قدموں اندر اسٹور میں چلی آئی اور بڑی پیٹی کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے اسے ایک ہی انداز میں وہاں بیٹھے

کتنی دیر گزری ہوگی کہ قدموں کی آہٹ سن کر تیزی سے کھڑی ہوگئی۔ بجی کے سفید چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے آنکھیں فرش پر مرکوز کردی تھیں۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ تجھے مت کی بات بتائی جائے تو روٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ رونے لگتی ہے۔ کیوں گئی تھی تو؟ او تجھے ذرا حیا نہ آئی غیر مردوں کے ساتھ گپیں لگاتے ہوئے۔"

اس کا ضبط جواب دے گیا۔ آنسو، آنکھوں سے چھلک کر رخساروں کو بھگونے لگے۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو بجی! میرا کوئی قصور نہیں۔"

"تو کس کا قصور ہے۔ خبردار آنسو ایک نہ نکلے تیری آنکھ سے ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ تماشا بنا رکھا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہے۔"

آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔

"جانتی ہے وہ اونیل کینٹ کا بدمعاش ترین لڑکا ہے۔ ایک نمبر کا لفنگا ہے اور جس لڑکی کی تو سہیلی بنی پھرتی ہے۔ اس کا آگا پیچھا کسی کو معلوم نہیں۔ لوگ کہتے ہیں بھگا کر لایا ہے کہیں سے۔ آوارہ لڑکی ہے۔ راتیں گزارتی ہے اس کے ساتھ۔"

"اس پر تہمت نہ لگاؤ۔ وہ اپنے انکل آنٹی کے گھر جا کر رہتی ہے۔"

"رہن دے وڈی مولون! تہمت نہ لگاؤ۔ کون سا انکل اور کدھر کی آنٹی اونیل اکیلا رہتا ہے۔ اسی کے پاس آتی ہے ہمیں تو آج تک کسی انکل آنٹی کا پتا نہیں چل سکا۔ اللہ جانے کیا چکر چلا رکھا ہے۔ رونا تو بند کر" وہ جھلا کر بولا۔

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے اس بات پر غصہ آگیا کہ میرے لائے ہوئے سموسے اٹھا کر تو فقیروں کو پکڑا دیتی ہے۔ مجھ سے اتنی نفرت اور اس سور کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھاتی ہے۔ میں منافق نہیں ہوں عائشہ، جو دل میں ہو کہہ دیتا ہوں بھانویں کسی کو کوڑا لگے۔ تجھ پر اعتبار ہے مجھے، تیری عقل پر اعتبار نہیں۔ اس لڑکی سے ملنا چھوڑ دے کسی مصیبت میں ڈالے گی تجھے۔ میری آج کی کہی بات پلے باندھ لے۔ وہ لڑکی صحیح نہیں ہے۔ تو پرلے درجے کی بے وقوف ہے۔ دنیا بڑی چالاک ہے۔ آنکھوں کے سامنے بندہ غائب کردیتے ہیں، لوگ اور پتا بھی نہیں چلنے دیتے۔ کل سے ملنا بند کردے۔ صاف بتادے اسے کہ تو نہیں مل سکتی۔ اور نہ ہی کہیں باہر جا سکتی ہے اس کے ساتھ۔ اپنی پڑھائی سے مطلب رکھ بس۔ سیدھی کالج جا اور سیدھی گھر واپس آ۔ کسی سے

میل ملاقات رکھنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سمجھ آئی میری بات؟"

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

"او بول بھی۔ ہر وقت روتی نہ رہا کر۔ زیادہ رونے سے آنکھیں خراب ہوجاتی ہیں۔ ان آنکھوں کو تو نے خراب کیا تو میں بری کروں گا۔ ان سے دشمنی نہ کیا کر۔ بول بھی کچھ۔ جو کہا ہے، سمجھ میں آگیا ہے۔"

اس نے بزاخفش کی مانند سر ہلا دیا تھا۔ میری کے متعلق ایسی باتیں تسلیم کرنے سے اس کا دل انکاری تھا۔ بلاشبہ وہ آزاد خیال لڑکی تھی۔ لیکن سلجھے ہوئے عادات و اطوار کی مالک تھی۔ کبھی کوئی لغویات اس کی زبان سے نہیں سنی تھیں۔

اس دن کے بعد عائشہ محتاط ہوگئی۔ کالج میں اسے میری کا بڑا سہارا تھا، اسے انگلش میں دشواری پیش آتی تھی۔ ذرا جو میری سے کہہ دیتی تو وہ چاہے کتنی بھی مصروف ہوتی وقت نکال کر اسے پڑھانے بیٹھ جاتی۔ کالج میں فارغ اوقات وہ تقریباً ساتھ گزارتی تھیں۔ اب کہیں اتفاقاً بھی میری سے سامنا ہوجاتا تو وہ راستہ بدل لیتی۔

میری کی آنکھوں میں تاسف کی جھلک دیکھ کر وہ دل گرفتگی کے احساس میں گھر جاتی تھی۔ اس نے بھی عائشہ کے رویے کی تبدیلی کو بھانپ لیا تھا اور حتی الوسع اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اگر بات کرنا ناگزیر ہوتا تو اس کا انداز نہایت رسمی سا ہوتا۔ گفتگو چند جملوں سے آگے بڑھنے نہیں پاتی۔ عائشہ اپنے رویے پر نادم تھی لیکن ایک انجانا خوف دامن گیر تھا۔

میری سے لاتعلقی کے دنوں میں اس پر انکشاف ہوا کہ کالج کی بعض لڑکیاں اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور ویسے ہی افسانے کالج کی چار دیواری میں بھی گردش کرتے تھے جیسے وہ بجی کی زبان سے سن چکی تھی۔

اس کے باوجود وہ میری سے بدظن نہیں تھی اور ان قصوں کو بے بنیاد اور من گھڑت تصور کرتی تھی البتہ میری سے میل ملاقات نہ رکھنے میں ہی عافیت تھی۔ لہٰذا وہ خود پر جبر کر کے عافیت تلاش کر رہی تھی۔

یہاں اس کا دل ویسے بھی نہیں لگتا تھا۔ اب میری سے قطع تعلق کے بعد وقت بتانا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ دن سست روی سے رینگتے تھے۔ کسی سوسمار (گوہ) کی مانند زمین میں پاؤں گاڑے جمے رہتے، کبھی معمولی سا آگے سرک جاتے۔ یوں جیسے کوئی دشوار گزار پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھتے ہوئے تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہانپنے لگے۔

✠ ✠ ✠

اس روز بسوں کی ہڑتال تھی۔ اس کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ کالج جائے بنا چارہ نہ تھا۔ سو وہ صدف کے ساتھ فوجی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ اس سے قبل بھی وہ دو تین دن لگاتار اس گاڑی میں جا چکی تھی۔ کیونکہ پرائیویٹ بس سے سفر کرنے میں دیر ہو جانے کا احتمال ہوتا تھا۔ اور ان دنوں وہ وقت سے پہلے پہنچنے کی متمنی تھی۔

چوبی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پہلے بھی گاڑی کا ڈرائیور اسے تنبیہہ کر چکا تھا کہ بغیر بس پاس کے سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے، وہ سمٹی ہوئی اور کسی قدر چھپ کر بیٹھی تھی جب سیڑھی کو سیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے آدمی کی نظر اس پر جم گئی۔

''آپ پھر آ گئی ہو؟ پہلے بھی منع کیا تھا آپ کو۔'' اس نے کرختگی سے کہا۔

''پیپرز ہو رہے ہیں اور آج بسوں کی ہڑتال ہے۔ آج جانے کی اجازت دے دیں۔ کل نہیں آئے گی۔'' صدف جلدی سے بولی تھی۔

''نہیں بی بی! ہمیں اجازت نہیں ہے اوپر سے۔ کارڈ رکھے بغیر کوئی لڑکی اس گاڑی میں نہیں جا سکتی۔ پہلے اس کا کارڈ بنواؤ۔ چلو بی بی! نیچے اتر جاؤ۔'' وہ دوبارہ سیڑھی کو زمین پر ٹکانے لگا۔

عائشہ نے متذبذب نظروں سے صدف کو دیکھا۔

''انکل بڑی زیادتی ہے یہ۔ ایک دن جانے سے کیا قیامت آ جائے گی۔ آخری بار جانے دیں۔ کل اگر آئے تو بے شک اتار دیجیے گا۔''

''بحث نہ کرو بی بی! میں نے بتایا نا ہمیں اجازت نہیں ہے۔ ہم بالکل نہیں لے کر جا سکتے۔''

'اس کی جگہ کسی میجر کی بہن ہوتی، کرنل، بریگیڈیئر کی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی کیسے

اتارتے آپ، آپ کو ذرا بھی احساس نہیں۔ اس کا پیپر رہ جائے گا۔ بس تو کوئی ہے نہیں آج، پیدل چل کر جائے گی یہ؟''

اس بار صدف کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کا خاموشی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عائشہ کو سفر کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے چہرے کی کرختگی ہنوز برقرار تھی اور وہ سیڑھی کے ڈنڈے پر ہاتھ دھرے یوں جھکا ہوا تھا جیسے عائشہ کے اترنے کا منتظر ہو تا کہ سیڑھی کو واپس کھینچ سکے۔

سبکی اور پریشانی کے ملے جلے احساسات نے عائشہ کے اعصاب کو بری طرح نرغے میں لے لیا تھا۔ صدف نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کندھے اچکا دیے تھے۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اتر جائے، وہ سر جھکائے ہوئے اٹھی اور نیچے اتر آئی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

سرمئی سڑک ویران پڑی تھی۔ اکا دکا سائیکل سوار، موٹر سائیکل والے اور پیدل چلنے والے پھیلی ہوئی بے رونقی کو شکست دینے میں ناکام تھے۔ اسے اپنے حلق میں نمک کا کھارا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی بے مقصد سڑک کے کنارے کھڑی رہی تھی واپسی کے لیے مڑتے ہوئے اس نے ایک کار کو اپنے قریب رکتے دیکھا تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو عائشہ؟'' میری کی آواز پر اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اونیل تھا۔

''آج تو پہیہ جام ہڑتال ہے نا۔'' اس نے کہا تو اونیل نے خفیف سا سر ہلا دیا۔

''تم کس کا انتظار کر رہی ہو؟ بس تو آج نہیں ملے گی۔ چلو تم ہمارے ساتھ آ جاؤ۔'' اونیل نے بازو لمبا کر کے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے پیر سختی سے زمین کے ساتھ جڑ گئے۔

''عجی شاید تھوڑی دیر میں ادھر سے گزرے گا۔ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

''پتا نہیں کب گزرے گا وہ، تمہارا پیپر بھی تو ہے آج۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ چلو بیٹھ جاؤ، میں تمہیں اغوا تو نہیں کر کے لے جاؤں گی۔ نہ ہی مجھے کوئی چھوت کی بیماری ہے جس سے تم خوفزدہ ہو۔'' میری کے لہجے میں مخفی چبھن اس سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

اونیل نے اس سارے عرصے میں ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، شاید اب

بیک ریسٹورنٹ والا واقعہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

''میں چلی جاؤں گی۔ آپ جائیں۔ عجی مجھے چھوڑ آئے گا۔'' اس نے انداز میں قطعیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

میری نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ''عائشہ مجھے پتا ہے عجی تمہیں چھوڑنے نہیں جائے گا۔ یقیناً آرمی کی گاڑی سے تمہیں اتار دیا گیا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے ساتھ جانے سے تم کیوں کترا رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ اگر تم ضد کر رہی ہو تو میں بھی ضد پر اتر آئی ہوں تمہیں لے کر ہی جاؤں گی۔ بیٹھو اندر۔'' اس کا اصرار اتنا بڑھا کہ مجبوراً عائشہ کو بیٹھنا پڑا۔ اس کے بیٹھتے ہی اونیل نیچے اترا اور گھوم کر میری کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''آج تم ڈرائیو کرو، میں تمہارے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔ نہ ہی تمہیں ہدایات دوں گا، اپنی مرضی سے گاڑی چلاؤ۔ سڑک خالی پڑی ہے۔ آج تمہارا راج ہوگا۔'' وہ عائشہ کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو میری گردن موڑ کر پرجوش لہجے میں بولی۔

''میں اکیلی.....؟ میں اکیلی ڈرائیو کروں گی؟''

''ہاں تم اکیلی.....اس کے بغیر تم میں اعتماد نہیں آ سکتا۔''

عائشہ نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا تھا۔ ''میں آگے بیٹھ جاتی ہوں آپ کے ساتھ۔''

''نہیں پلیز تم وہیں بیٹھی رہو۔ مجھے گھبراہٹ ہوگی اس طرح'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر کھسک کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ کار ایک جھٹکے سے سڑک پر پھسلنے لگی تھی میری کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد عائشہ کو محسوس ہوا کہ اونیل کی نظریں اس پر مرتکز تھیں۔ وہ سمٹ کر کونے میں دبک گئی تھی۔ میری پہلی بار آزادی سے ڈرائیو کرنے پر اتنی خوش تھی کہ اسے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ جھلستی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر، اس نے دوپٹے کا پلو پیشانی سے نیچے کھینچ لیا تھا۔ دل میں وہ دعا مانگ رہی تھی کہ یہ سفر جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ اپنی غلطی پر شدید پچھتاوا ہو رہا تھا۔ معاً اس نے اونیل کے ہاتھ کو کسی سانپ کی مانند سیٹ پر رینگتے دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ سمٹ کر کھڑکی کے ساتھ لگ گئی۔ ہاتھ کی حرکت نہیں تھمی تھی۔ وہ مسلسل اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر کلبلاتی انگلیوں نے اس کے گھٹنے کو چھو لیا تھا اس کا وجود جھکڑوں کی زد میں آ گیا۔ نہ جانے اس میں

کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے اونیل کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی شاید چند ثانیوں کے لیے تھمی تھی۔

میری حیرت کی زیادتی سے مسخ چہرہ لیے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اونیل نے چلاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ڈور لاک کھینچا اور اسے باہر دھکیل دیا۔

''یو بلڈی بچ، تمہاری اتنی جرات، میں دیکھ لوں گا تمہیں، you whore.....''

مغلظات بکتا ہوا وہ نیچے اترا اور میری کو ہاتھ سے پرے دھکیل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک ہچکولا کھا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی، لرزیدہ ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ یوں لڑکھڑا رہی تھی جیسے اس کے قدموں تلے ٹھوس زمین کے بجائے پانی کا فرش بچھا ہو۔

✠ ✠ ✠

اونیل کی بات سن کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔

''پلیز اونیل تم اتنا غصہ مت کرو۔ لعنت بھیجو ساری بات پر۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ عائشہ کا دماغ خراب ہے۔ نارمل نہیں ہے وہ۔''

''میرا بھی دماغ خراب ہے۔ اس نے میری انسلٹ کی ہے۔ میں کسی طرح بھول نہیں سکتا۔ آئی سویئر میرا ہاتھ غلطی سے بچ ہو گیا۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا، وہ مجھ سے پوچھ سکتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ مگر اس نے..... میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں یہ نہیں کر سکتی اونیل! وہ اب مجھ سے نہیں ملے گی۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے نہیں ملتی تھی۔ اس واقعے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔ ہر قیمت پر۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہیں اسے لانا ہی ہوگا۔ کسی بھی طرح۔''

اس نے سر اٹھا کر فلیم ٹری کے شعلہ رو پھولوں اور ان میں سے جھانکتی ہوئی آسمان کی نیلاہٹ کو دیکھا۔ یہ امتزاج ایسا تھا جیسے کسی کبودی کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہو۔

''ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''میں اس ایک بات کے سوا نہ کوئی بات سنوں گا اور نہ کروں گا۔ مجھے اس کے علاوہ کسی بھی چیز سے مطلب نہیں۔ تم اسے کب لاؤ گی؟''

''میں پریگننٹ ہوں اونیل! اور میں اس بات کو مزید چھپا نہیں سکتی۔ تم فوراً اس شادی کو ڈکلیر کر دو۔ ورنہ کچھ دنوں میں میرا جسم خود لوگوں کو بتا دے گا، کالج میں میرے لیے پہلے ہی بہت حقارت پائی جاتی ہے۔ لڑکیاں مجھے بدکردار اور آوارہ سمجھتی ہیں۔''

اس کا خیال تھا اونیل یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔ پیار سے اس کی پیشانی پر بوسہ دے گا۔ لیکن اس کی توقع کے برعکس وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات میں ذرا سی بھی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز کی کرختگی کچھ اور بڑھ چکی تھی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اسے کب تک لا رہی ہو تم۔''

اسے دھچکا لگا تھا۔ اونیل اس قدر بیگانگی کیسے برت سکتا تھا۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ تم ایک بچے کے باپ بننے والے ہو۔''

''جو میں نے پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔''

صدمے سے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''تم اس کے ساتھ..... کیا کرو گے اس کے ساتھ؟''

''کچھ نہیں ہوگا اسے، کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں صرف ایک بار اسے اپنے رحم وکرم پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے تھپڑ مار کر اس نے کتنی سنگین غلطی کی ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی دیکھنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔''

''میں اسے مجبور کروں گی، وہ تم سے معافی مانگ لے گی۔''

''میں ایک بات کو اتنی بار دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔ اور بالکل ویسا ہی جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس سے ایک انچ ادھر یا ادھر نہیں۔''

نارنجی پھولوں میں دھوپ نے آگ لگا دی تھی۔ پھولوں کے جھرمٹ جو شعاعوں کی حدت سے سلگ رہے تھے یک لخت بھڑک اٹھے۔ فلیم ٹری کی شاخوں پر مشعلیں جلنے لگیں۔

''یہ نہ کرو اونیل، پلیز یہ نہ کرو۔ وہ مر جائے گی، اس کے بعد میں کیا کہوں گی اس سے۔

خدا کے لیے اسے معاف کر دو۔ مجھے پتا ہے تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں تمہیں بے قصور سمجھتی ہوں پھر تم کس لیے ایسا کر رہے ہو۔"

"میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ ہاں یا ناں، میں جواب...... جو بھی تمہاری مرضی ہے بتا دو، لیکن ایک لفظ میں، اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا۔"

نہ جانے کتنی دیر وہ سر جھکائے سبز گھاس کو گھورتی رہی۔ بوجھل ساعتیں کسی اپاہج کی طرح گھسٹ رہی تھیں۔ پھر منوں وزنی گردن بمشکل سیدھی کرتے ہوئے وہ بولی۔ "نہیں۔"

اونیل کین چیئر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

اس نے یہ جملہ اتنی آسانی سے ادا کیا تھا جیسے کوئی کہہ دے۔ "میں سگریٹ نوشی ترک کر دوں گا۔"

اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ "وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے، مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے شاید۔ وہ کہہ رہا ہے چلو تمہیں ہاسٹل چھوڑ آؤں۔" اس نے خود کو دلاسا دیتے ہوئے بیٹھی سی آواز میں پوچھا۔ "تم نے ابھی کیا کہا اونیل؟"

"میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

اس نے سفا کی سے دہرایا۔

کبودی کٹھالی میں پگھلتا ہوا سونا کناروں سے ابل کر اس کے وجود پر برسنے لگا۔ دہکتی آگ کے چھینٹے پڑنے سے آبلے بننے لگے۔

"تم نے اپنے ڈاکومنٹس دیکھے ہیں ان پر تمہارا کیا نام لکھا ہے۔ تم جتنے بھی ہاتھ پاؤں مار لو، ثابت نہیں کر سکتیں کہ تم مسلم ہو۔ ہمارے نکاح کا ثبوت بھی تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس بچے کے بارے میں سوچا ہے تم نے، تم جس قدر مرضی چیخو چلاؤ۔ اسے ناجائز ہی سمجھا جائے گا۔ لوگ تمہیں پتھر ماریں گے۔ تم پر تھوکیں گے۔ اپنی ماں کے پاس بھی تو نہیں جا سکتیں تم۔ ذرا سوچو، تم کہاں کھڑی ہو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں تو کیا ہو جاؤ گی تم۔ تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے جو کہا ہے وہ تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اچھی طرح سوچو۔"

اسے دہکتے الاؤ میں جھونک کر وہ چلا گیا تھا۔ وہ کھلے ہوئے منہ کے ساتھ دم سادھے بیٹھی تھی۔ فلیم ٹری کی شاخوں سے جدا ہوتے انگارے ایک ایک کر کے اس پر گرتے چلے جا رہے

تھے۔

✠ ✠ ✠

"عائشہ! صرف تمہاری خاطر میں نے اونیل سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔ صرف تمہاری خاطر، مجھے بہت دکھ ہے۔ وہ قسمیں کھا رہا تھا۔ بڑی کوشش کی اس نے یقین دلانے کی کہ جو ہوا نادانستگی میں ہوا۔ مگر میں نہیں مانی۔ مجھے اس کی باتیں فریب لگیں۔ انکل نے بھی اس کا گھر میں آنا بند کر دیا ہے۔"

اپنی پوری زندگی میں اسے جھوٹ بولنے میں اتنی دقت کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ حلق میں کانٹوں کی باڑھ تھی جو لفظوں کو روک رہی تھی۔

"وہ کہتا تھا مجھے اس کے پاس لے جاؤ۔ میں معافی مانگ لوں گا۔ بہت شرمسار تھا۔ سب نے اسے لعنت ملامت کی۔ انکل تو اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔"

عائشہ نے گھاس پر بکھری اپنی کتابیں اکٹھی کیں اور خاموشی سے انہیں تھیلے میں منتقل کرنے لگی۔

"تم پلیز مجھے معاف کر دو۔ میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میرے ساتھ اس طرح کا رویہ نہ اپناؤ۔ کئی راتوں سے میں سو نہیں سکی۔ اس کی گھٹیا حرکت کی سزا مجھے نہ دو، میں خود کو مجرم سمجھتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

عائشہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے منت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے بتاؤ میں نے کیا کیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر میں زمین میں گڑ جاتی ہوں۔ کاش میں نے اس دن تمہیں لفٹ نہ دی ہوتی میری وجہ سے تم پیپر میں لیسٹ ہو گئیں۔ پروموٹ تو کر دیا جائے گا لیکن کتنا افسوس ہوگا تمہیں کلاس ٹیسٹ میں ہسٹری میں تمہارے سیکنڈ ہائی ایسٹ مارکس آئے تھے۔ سارے سال کی محنت اکارت گئی۔ آئی ایم ویری سوری، تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔"

عائشہ نے اس کی طرف دیکھے بنا نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور رخ پھیر کر چلی گئی۔ وہ گھاس کی پتیاں نوچنے لگی۔ گکروندے کے لمبی پتیوں والے زرد پھولوں پر منڈلاتے بھنوروں کے بے چین پروں کی تھرتھراہٹ اس کے کانوں میں گھسی جا رہی تھی۔ گل مخمل کے پودوں سے لہو نچڑ رہا

تھا۔اس نے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے ایک طویل سانس لینے کی کوشش کی۔اس کا حلق ایسی بنجر زمین کی مانند خشک ہو رہا تھا، جسے صدیوں سے بارش کی ایک بوند نصیب نہ ہوئی ہو۔

اس سے پہلے بھی اس نے عائشہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹ سکی تھی۔ وہ اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھی۔اس کا دماغ سنسنا رہا تھا، بند بند میں اضمحلال رینگتا تھا۔جب وہ اسے بولنے پر آمادہ نہ کر سکی تھی تو کہیں ساتھ لے جانے میں کیونکر کامیاب ہو سکتی تھی۔انگلیاں ہونٹوں میں دبا کر وہ ناخن کترنے لگی تھی۔

''اونیل نے مجھے چھوڑ دیا تو پھر کیا ہوگا؟''اس ''پھر کیا ہوگا'' سے آگے سوچ کا تپتا صحرا تھا۔جس میں تادیر بھٹکنے کے بعد وہ پیروں میں آبلوں کی کسک اور آنکھوں میں ریت کی چبھن کے سوا کچھ نہیں پا سکی تھی۔

✠ ✠ ✠

فورتھ ایئر کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔اس نے فون پر ابا کو ہسٹری کے پیپر کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔انہیں بتاتے ہوئے ضبط کے باوجود اسے رونا آ گیا تھا۔وہ اسے تسلی دیتے رہے، دل مضبوط رکھنے کی ہدایت کرتے رہے، جو وہ کسی بھی ملاقات میں دہرانا نہیں بھولتے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس ہنر سے نا آشنا ہے، اسے دل کو مضبوط رکھنا نہیں آتا لیکن لفظ تالو سے چپٹ کر رہ گئے تھے۔وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

کالج میں کئی بار میری نے اس سے معافی مانگی تھی، اس کا راستہ روک کر منتیں کی تھیں۔ اسے میری سے کوئی گلہ نہیں تھا، لیکن اس سے بات کرنے کو بھی جی نہیں مانتا تھا۔

اس روز وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ جب سواری کا انتظار کرنے والوں کے ہجوم میں میری دکھائی دی۔اسے حیرت ہوئی۔اتنی چلچلاتی دھوپ میں وہ وہاں کیا کر رہی تھی۔شاید اس نے اونیل سے ملنا واقعی چھوڑ دیا تھا۔اور بس پر کینٹ جا رہی تھی۔ یا پھر گاڑی خراب ہو گی۔سڑک پر رکنے والی بس کی طرف لپکتے ہجوم نے اس کی سوچوں کو منتشر کر دیا تھا۔خاصی جدوجہد کے بعد وہ بس میں سوار ہوئی، اسے بالکل خبر نہ ہوئی، میری اس بس پر بیٹھی تھی۔یا اب تک بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ اس نے کسی خالی نشست کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔لیکن مایوسی کا سامنا ہوا۔ایک

سرے سے دوسرے سرے تک لوگ ٹھنسے ہوئے تھے، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اکثر اوقات اسے کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑتا تھا۔انسانوں کے ہجوم نے گرمی اور گھٹن کو دوچند کر دیا تھا۔دوپٹے کے پلو سے پیشانی پر چمکتی پسینے کی بوندیں صاف کرتے ہوئے وہ اس چھوٹے لڑکے کی طرف متوجہ ہوئی جو کندھے سے پانی کا کولر لٹکائے لوگوں میں سے جگہ بناتا اس کے پاس آ کر رک گیا تھا۔اور شاید اسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی۔پہلی بار اس کے الفاظ سماعت سے ٹکرائے تو کوئی مفہوم پیدا نہ کر سکے۔وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''پیچھے باجی آپ کو بلا رہی ہیں۔ان کی طبیعت خراب ہے ان کے ساتھ کوئی نہیں..... آپ ان کی بات سن لیں۔''

لڑکے نے اونچی آواز میں دوبارہ بتایا تھا۔اس نے الجھن زدہ نظروں سے اس سمت دیکھا جدھر اس لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔اور پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھی، تین عورتوں اور دو مردوں کے گھیرے میں بس کے فرش پر اکڑوں بیٹھی ہوئی میری تھی۔اس کی رنگت سورج مکھی جیسی زرد ہو رہی تھی۔اور آنکھیں پانی تلے ڈوب رہی تھیں۔ایک عورت نے اس کی کلائی تھام کر اسے دائیں بائیں لڑھکنے سے روک رکھا تھا۔

''عائشہ! میری طبیعت سخت خراب ہو گئی ہے۔''اس پر نظر پڑتے ہی میری نے کراہ کر کہا۔

''کیا ہوا جی؟''اسے اس حال میں دیکھ کر وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک اسٹوڈنٹ لڑکے کی منت کر کے سیٹ خالی کروائی۔

''یہاں بیٹھ جائیں آرام سے۔''وہ خود اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔میری کے کملائے ہوئے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھسل رہی تھیں۔

''میں نے کینٹین سے برگر لے کر کھایا تھا۔ذائقہ کچھ عجیب سا تھا۔بھوک بہت لگی تھی۔ بس کھا لیا۔شاید اس میں کوئی چیز باسی تھی۔لگتا ہے مجھے فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے۔معدے میں سخت جلن ہو رہی ہے۔''وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''آپ نے کبھی اس طرح گرمی میں بس کا سفر نہیں کیا نا، اس لیے دل گھبرا گیا ہے۔ حوصلہ کریں جی کینٹ تو آنے ہی والا ہے۔''وہ اس کے کندھے پر ہاتھ دھرے تسلی دے رہی تھی۔

''عائشہ! میرا ایک کام کرو۔ میرے ساتھ کینٹ اتر جانا اور گھر تک چھوڑ آنا، پلیز میری ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی، قے آ رہی ہے، کہیں راستے میں گر گئی تو کون سنبھالے گا مجھے۔ صرف دس پندرہ منٹ لگیں گے، پلیز انکار نہ کرنا۔'' عائشہ چند لمحے چپ رہی تھی۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

''آپ اپنے موبائل پر گھر اطلاع کر دیں۔ اسٹاپ پر آپ کو لینے کوئی آ جائے گا۔''

''میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہے۔ گھر میں اس وقت آنٹی کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے کون لینے آئے گا۔ پلیز تم مان جاؤ۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ عائشہ تذبذب کا شکار تھی۔ ہامی بھرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اور انکار سے میری کی اتری ہوئی صورت اور پانی سے بھری آنکھیں روک رہی تھیں، کوئی جواب دینے کے بجائے وہ خاموش کھڑی رہی۔ میری اگلی نشست سے سر ٹکائے نڈھال نظر آتی تھی۔ کنڈکٹر نے کینٹ اسٹاپ کی آواز دی تو اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر عائشہ کو دیکھا۔

''میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' اس کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک آیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر دوبارہ ڈھیر ہو گئی تھی۔

عائشہ سر جھٹک کر اسے اٹھنے میں مدد دینے لگی۔

''حوصلہ کریں جی۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ہمت کریں۔ اسے احتیاط کے ساتھ بس سے اتار کر وہ اس کی کمر تھپک رہی تھی۔

''مجھے چکر آ رہے ہیں۔'' نقاہت بھری آواز میں بمشکل کہہ کر وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔

''میں ہوں آپ کے ساتھ، حوصلہ رکھیں۔ میں گھر تک چھوڑ کر آؤں گی جی۔''

اسٹاپ پر موجود ایک عورت کی مدد سے اس نے میری کو بدقت کینٹ کے اندر جانے والی ویگن میں سوار کرایا تھا۔

وہ مسلسل آنکھیں بند کیے اس کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی رہی تھی۔ اس کے انکل کا گھر خاصے ویران سے علاقے میں تھا۔ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں تو سارے کینٹ میں ہی ویرانی بکھری تھی مگر یہ جگہ خصوصیت سے سنسان تھی۔ اکثر پلاٹ خالی پڑے تھے۔ کوئی بھی دو بنگلے جڑے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہر دو گھروں کے درمیان بے آباد پلاٹوں کا خلا حائل تھا۔

سڑک کے جوانب سیٹھے کے پودے، آک کی بے ترتیب جھاڑیاں اور نرسلوں کے جھنڈ کھردری زمین پر دور تک رینگتے چلے گئے تھے۔

سرمئی روغن والے گیٹ کے سامنے پہنچ کر عائشہ نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔ میری کو سہارا دیے ہوئے یہاں تک لاتے لاتے وہ ہانپ گئی تھی۔ دھوپ میں اتنی شدت تھی کہ جسم کی تمام توانائی مساموں کے راستے خارج ہوئی جاتی تھی۔

''اچھا جی۔ میں اب چلتی ہوں۔ جا کر اے سی والے کمرے میں آرام کریں۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

میری کچھ نہیں بولی۔ اس نے دونوں ہاتھ یوں ہوا میں لہرائے تھے جیسے کسی شے کو گرفت میں لینا چاہتی ہو۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کراہنے لگی۔ اسے چند زوردار ابکائیاں آئی تھیں۔

عائشہ نے بھاگ کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

''گیٹ کھلا ہوگا، مجھے اندر لے جاؤ۔ میری آنتیں جیسے منہ کو آ رہی ہیں۔''

اس نے میری کو کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا اور گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے اسے اندر لے آئی۔ میری کا پسینے میں ڈوبا کانپتا ہوا جسم اس کے ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہا تھا۔

اسے کمرے میں بیڈ پر لٹانے تک کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ گھر میں کوئی نہیں؟''

''آنٹی اوپر اپنے کمرے میں سو رہی ہوں گی۔ تم مجھے پانی پلا کر انہیں بلا لاؤ، اور کوئی نہیں ہوتا اس وقت۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

عائشہ نے کندھے سے کتابوں والا بیگ اتار کر کرسی پر رکھ دیا ''فریج کہاں ہے جی؟''

''ادھر ساتھ والے کمرے میں۔''

سائیڈ ٹیبل پر دھرا گلاس اٹھا کر وہ مشرقی دیوار میں نصب دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس کی گدی پر ہاتھ رکھ کر کسی نے دھکا دیا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

اس کے سامنے اونیل تھا۔ اسے لگا وہ ریت کی بنی ہوئی ہے، مڑ کر بھاگنے میں اسے صدیاں لگ گئیں۔ ایک لڑکا اور دروازے اور اس کے درمیان ناقابل عبور رکاوٹ کی طرح موجود تھا۔ شاید وہ ان تین لڑکوں میں سے ایک تھا جو ریسٹورنٹ میں اونیل کے ساتھ آئے تھے۔ اس کا چہرہ مانوس لگتا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ پہچاننے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف بھاگ پڑی جو اونیل کی پشت پر موجود تھا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا گیا۔ اونیل نے اس کے چہرے پر تھوک دیا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ مگر موسیقی کی آواز اس کی چیخوں سے زیادہ بلند تھی۔

بدنصیبی کی تجسیم اگر ممکن ہوتی تو اس کی باقی وضع چاہے جیسی بھی ہوتی پاؤں لازماً بلی کے ہوتے۔ بدنصیبی ہمیشہ گربہ پائی سے چل کر آتی ہے۔ بنا کوئی آہٹ کیے۔ بنا کوئی شور مچائے۔

اس کی ہنسلی کی ہڈی کسی ٹھوس چیز کے نوکیلے کنارے سے ٹکرائی۔ شاید وہ کوئی میز تھی یا کچھ اور چیزوں کی شناخت کھو چکی تھی۔

گلوکار کسی اجنبی زبان میں گا رہا تھا۔ گیت کی دھن شوخ تھی اور سر بہت اونچے۔

فلیم ٹری کے آتشیں پھول بھک سے جل اٹھے۔ نارنجی شعلے ڈالیوں پر رقصاں ہو گئے..... فضا میں انسانی گوشت جلنے کی سڑاند پھیل رہی تھی۔

گلوکار چلائے جا رہا تھا۔ الفاظ اس قدر نامانوس تھے جیسے کسی مختلف سیارے کی زبان ہوں۔

فلیم ٹری بھڑ بھڑ جلنے لگا۔ آگ کی لپٹیں آسمان کی سمت اٹھ رہی تھیں۔

اس کے چاروں اور بو کے بھبکے تھے۔ وہ سانس نہیں لے رہی تھی مگر بو اس کے نتھنوں میں مسلسل گھس رہی تھی۔

گلوکار گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اپنے جسم کی پوری قوت سے چلا رہا تھا۔

اس کی رگوں میں سرخ اندھیرا اتر رہا تھا۔ اندھیرا ایک اژدہا تھا جو اسے نگل رہا تھا۔ تعفن زدہ تاریکی میں ڈوب رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

جونہی عائشہ، اونیل کے بیڈ روم میں داخل ہوئی، وہ بستر سے اتری اور دروازے سے لگ کر آہٹ لینے لگی۔ اس کا دل کسی گرداب میں مبتلا تھا۔ ایک دم اندر سے موسیقی کی تیز آواز آنے لگی۔ آواز اتنی اونچی تھی کہ اسے بے اختیار کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا پڑیں۔ والیوم آخری حد تک اونچا کر دیا گیا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر بند دروازے کو دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ موسیقی کی تیز آواز سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔

اونیل نے اسے ہدایت کی تھی کہ عائشہ کو کمرے میں بھیجنے کے بعد اوپر چلی جائے اور جب تک بلایا نہ جائے، نیچے نہ اترے۔ ملازمین کو بھی آج اس نے چھٹی دے رکھی تھی۔ عائشہ کا سامنا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ مگر وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پاؤں فرش میں دھنس چکے تھے۔ چاہنے کے باوجود وہ ہل نہیں سکتی تھی۔ نہ جانے اسی عالم میں اسے کتنی دیر گزر گئی، دروازہ نہیں کھلا۔ بے ہنگم شور دماغ کی نسوں کو شکنجے میں کس کر بل دیتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا کچھ دیر اور دروازہ نہ کھلا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ پھر اس نے خود کو دستک دیتے پایا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ اس کے ہاتھوں کی جنبش میں وحشت آتی جا رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں شل ہونے لگیں، کلائیوں کی رگیں ٹوٹنے لگیں اور وہ دروازے پر ضربیں لگاتی رہی۔ شاید دستک کی آواز اس شور میں اپنے وجود کا معمولی سا احساس دلانے میں بھی ناکام تھی مگر وہ کچھ سوچے سمجھے بنا دروازہ بجاتی رہی..... دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس کے بدن سے ساری توانائی نچڑ کر رہ گئی تھی۔ کچھ یاد آنے پر وہ بھاگتی ہوئی اونیل کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ اندر بتی بجھی ہوئی تھی۔ وہ باہر سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی البتہ کمرے کے اندر سے اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ عائشہ کو اپنا چہرہ دکھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دن کے اجالے میں بھی اسے چاروں طرف گھور تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ کانپتی ہوئی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیے اس کی نگاہ بلا ارادہ عقبی گیٹ کی طرف جانے والی روش پر گئی تھی۔ گیٹ سے ذرا ہٹ کر سکھ چین کے پیڑ تلے شیراز کی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ اسے کسی ان دیکھی رکاوٹ سے ٹھوکر لگی۔

''شیراز، اونیل کے ساتھ ہے..... وہ دونوں اندر ہیں.....''

کسی ہاتھ نے اسے حلق سے گرفت میں لے لیا۔ اس کا سانس سینے کے اندر دم توڑنے لگا۔

موسیقی کی آواز ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر کھڑکی کے سامنے آئی اور دونوں ہاتھ شیشے پر مارنے لگی۔ وہ حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ اس کی آواز اندر نہیں سنی جا رہی۔ چیختے چیختے اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ چیخے جا رہی تھی، درد سے سن ہوتی ہتھیلیاں شیشے سے ٹکراتی جا رہی تھیں۔

کسی نے اسے بازو سے دبوچ کر پیچھے کھینچ لیا۔ شاید وہ اونیل تھا۔ اس کے خدوخال قطعی اجنبی تھے۔ آنکھوں میں اتنی سرخی تھی کہ وہ خون کے جمے ہوئے لوتھڑے دکھائی دیتی تھیں۔ پیشانی پر ایک سبز رگ غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھی۔ یہ سبز رنگ زہر کا رنگ تھا۔ دہانے کے گرد ایسی لکیریں کھنچی تھیں جیسے کوئی موی مجسمہ آگ سے جھلس گیا ہو۔ وہ اونیل تو نہیں تھا۔ بے شک اس کی صورت اونیل سے ملتی تھی مگر وہ کوئی اور تھا۔ کوئی اجنبی جسے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''تم نے کہا..... تم نے کہا تھا، اسے کچھ نہیں کہو گے۔ شیراز اندر کیوں.....؟'' اس کی سہمی ہوئی آواز ایک گھٹی گھٹی چیخ سے مشابہہ تھی۔

''تم یہاں کیوں موجود ہو۔ میں نے جو کہا تھا ویسے کیوں نہیں کیا۔'' اسے کندھے سے پکڑ کر وہ ساتھ گھسیٹنے لگا۔ اس کی آواز بھی کانوں کو مانوس نہیں لگتی تھی، ''اوپر چلو، پیکنگ کر لینا۔ ہم کچھ دنوں کے لیے ملتان جا رہے ہیں۔ ضرورت کی چند چیزیں رکھ لو، زیادہ سامان لینے کی ضرورت نہیں ہے اور..... کوئی بات مت کرو۔''

''عائشہ کے ساتھ تم لے.....''

''خاموش رہو۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا۔''

اسے اسٹڈی روم میں بند کر کے وہ چلا گیا تھا۔ اس کمرے کی کوئی بھی کھڑکی باہر نہیں کھلتی تھی۔ اب وہ نیچے نہیں جھانک سکتی تھی۔ ایک کرسی کے ہتھے کا سہارا لے کر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ اونیل دیوتا نہیں انسان تھا۔ اور اسے اس انسان سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

✠ ✠ ✠

سرکنڈے کے جھاڑوں میں جلتی ہوئی زمین پر وہ چت لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی اور

پتلیاں ساکت تھیں۔ ہوا راکھ سے اٹی ہوئی تھی۔ آسمان پر کوے، چیلیں اور گدھ چکرا رہے تھے۔ روح کیوڑے کی گاڑھی خوشبو سے فضا بوجھل تھی۔ وہ اس مشک کو پہچانتی تھی۔ مردوں کو دفنانے سے پہلے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ بے چین کر دینے والی، دل کو پژمردگی اوڑھانے والی اس کثیف خوشبو کا موت سے گہرا ربط تھا۔ شاید وہ بھی مر چکی تھی اور ساکت آنکھوں سے کفن کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اسی طرح لیٹے خاصی دیر گزر گئی تو اسے شک گزرا کہ وہ زندہ ہے اور پھر یہ جان کر وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ واقعی زندہ تھی۔ اس کی نبض اب تک چل رہی تھی، دل اب تک دھڑک رہا تھا۔

''میں اب تک مری کیوں نہیں؟ موت کیوں نہیں دے دی مجھے؟ میں تجھ سے موت مانگتی ہوں۔ مجھے موت دے دے۔ میں کوئی بدلہ نہیں چاہتی۔ میں تجھ سے کوئی انصاف نہیں مانگوں گی بس میری ایک بات مان لے۔ مجھے موت دے دے۔ یہ کیا ہو گیا..... یہ تو نے کیا کر دیا؟ میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تو مجھے کوڑھی کر دیتا، اپاہج بنا دیتا، ساری زندگی کوئی خوشی نہ دیتا۔ مگر یہ نہیں..... یہ نہیں..... اللہ۔ ایسا نہ کرتا۔ یہ نہ کرتا میرے ساتھ۔ میں گندگی میں غرق ہوتی رہی اور تو دیکھتا رہا۔ میں کوڑے کا ڈھیر بن گئی اور تو نے کچھ نہ کیا..... یہ کیسے ہو گیا..... تو نے تو ہمیشہ مجھے اپنی پناہ میں رکھا ہے پھر آج کیا ہوا؟ تو نے مجھ سے نظر کیوں پھیر لی..... کیوں روٹھ گیا مجھ سے؟..... کون سی خطا ہوئی جس نے تجھے ناراض کر دیا، مجھے تیری نظر سے اوجھل کر دیا۔''

کہیں دور سے ٹریفک کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ اس نے پتھر جیسے بھاری سر کو جنبش دے کر ارد گرد دیکھا۔ ایک جھاڑی میں الجھی ہوئی چادر اور قریب ہی پڑا ہوا بیگ اسے نظر آ گیا تھا۔ آہستگی سے اٹھ کر اس نے ہاتھ پھیلایا، کروٹ لیتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ اس کی کمر کو جلتے سگریٹ سے داغا گیا تھا۔ ہنسلی کی ہڈی میں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں کراہوں کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے اس نے چادر کا سرا انگلیوں میں پھنسا کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

اس کے چہار اطراف ویرانہ تھا۔ سرکنڈے کی جھاڑیاں آک کے ناٹے پودے اور گندم کے کھیت تا حد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ ٹریفک کی آواز پر کان لگا کر اس نے سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور اندازاً ایک پگڈنڈی پر چل پڑی۔

ابھی دوپہر ڈھلی نہیں تھی۔ اس کے سر پر تیکھی دھوپ تنی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد پگڈنڈی کا اختتام ہوا تو ایک نیم پختہ ٹوٹی پھوٹی سڑک شروع ہو گئی۔ ٹریفک کا شور اب واضح

سے سنائی دے رہا تھا۔ وہ کیکروں کی خاردار چھاؤں میں چلتی رہی۔ اس سڑک کا آخری سرا ایک چٹیل میدان میں کھو گیا جس کے پہلو میں ریل کی پٹڑی بچھی تھی۔ پٹڑی کے پار جی ٹی روڈ تھا۔ پٹڑی عبور کر کے اس نے بسوں کے ماتھوں پر رقم شہروں کے ناموں سے اخذ کیا کہ اسے کس رخ پر سفر کرنا چاہیے۔ وہ اس جگہ سے واقف نہیں تھی مگر اتنا اندازہ اسے تھا کہ وہ اوکاڑہ شہر اور کینٹ کے درمیان کہیں موجود تھی۔ چند گز کے فاصلے پر Toll Tax کا بورڈ دیکھ کر اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ گھر سے تقریباً تین کلومیٹر دور تھی۔

لوگوں کی نظریں اس کے بدن میں نیزوں کی انیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ سڑک پر آتے ہی اس نے چہرے کو چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ گرداڑاتی سڑک پر نظریں جمائے وہ چادر کے دونوں پلو مٹھی میں بھینچے چلی جا رہی تھی۔ جب عقب میں ایک ایسی آواز سنائی دی جسے موت کی گھڑی سے پہلے وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی بھی ایسے شخص کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی جو اسے جانتا ہو، وہ کوئی بھی شناسا آواز سننے کی خواہاں نہیں تھی۔ مگر تمام خواہشیں پوری ہونے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ساری دعائیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔

بریڈ کمپنی کی وین اس کے پہلو میں رک چکی تھی۔

''تو کدھر تھی.....؟ پورا گھنٹہ اسٹاپ پر انتظار کرتا رہا۔ اب کالج سے کھجل ہو کر آ رہا ہوں..... چل ادئے اتر تو بس میں آ جا.....'' اس نے ساتھ بیٹھے لڑکے کو اترنے کا اشارہ کیا۔

اس کے پیروں تلے پختہ سڑک تپتی ریت میں بدل گئی۔ سفید ریت، جس کی تپش تلوؤں میں جذب ہو کر دماغ کو پگھلا دیتی ہے۔ وین کے اندر بیٹھتے ہوئے اسے یوں لگا تھا جیسے وہ کسی کٹہرے میں قدم رکھ رہی ہو۔

''تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ اتنی دیر ہو گئی آج، تجھے پتا ہے گھر میں سب کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ کہیں تو.....''

اس کے ہلدی پتے چہرے اور نیلے پڑے ہوئے ہونٹوں کو جن پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں، دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔ اس سے وہ سرد خانے میں پڑی کسی لاش کی مانند نظر آتی تھی۔

''کیا ہوا.....؟ او میرے اللہ..... بول..... کیا.....؟''

وہ چپ رہی۔ ''کیا کوئی لفظ میرے لیے رہ گئے ہیں؟ کیا مجھے اب تک بولنے کا حق

ہے؟''

''بول بھی..... تیرے کپڑے..... اونیل کے گھر سے آئی ہے؟ بول عائشہ۔''

وہ اب بھی خاموش تھی۔

''آج مجھے چپ کی مار نہ مار، بڑا چپ رہی ہے تو۔ آج چپ سے کام نہیں چلے گا۔ بول..... بتا تو نے کس کے ساتھ.....''

عجی نے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹا کر اسے جھنجھوڑا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کا سر جھکتے جھکتے گھٹنوں سے جا لگا تھا۔ عجی نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکا اور اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔ ایک ہاتھ اس نے گردن پر اس طرح جما دیا تھا کہ وہ سر کو ذرا سا بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔

''بول عائشہ..... تیری چپ نے بڑا دھوکا دیا مجھے۔ میں سمجھا، تجھے چپ رہنے کی عادت ہے۔ پر نہیں، میری بھول تھی۔ تجھے بولنا آتا ہے۔''

گردن پر اس کی ہتھیلی کے دباؤ کے باعث عائشہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اکھڑتی سانسوں کے دوران نہ جانے اس نے کیا کہا تھا۔ شاید ایک یا دو فقرے بولے ہوں گے کہ دوبارہ خاموش ہونا پڑا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون کے بلبلے پھوٹے تھے۔ عجی نے مٹھی بھینچ کر اس کے جبڑے پر ضرب لگائی تھی۔

''تو وہاں کرنے کیا گئی تھی؟ تو خود چل کر گئی اور کہتی ہے..... بے غیرت، تیرے اندر کا گند تھا جو تجھے وہاں لے گیا۔ اس حرامزادے، سور کے بچے کے پاس تو لینے کیا گئی تھی؟''

وہ منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تیری نمازیں، تیرے لمبے سجدے سب جھوٹ، سارا فریب، اپنی بدکاری پر پردہ ڈالتی رہی۔ تجھ میں اور گلیوں میں آوارہ پھرنے والی کتی میں کیا فرق رہ گیا۔ دل کرتا ہے، تیرا گلا دبا کر تجھے یہیں پھینک جاؤں۔''

اس کی گردن چھوڑ کر وہ انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

''ابھی چل کے اپنا سامان باندھ لے۔ میں تجھے کل صبح ہی چھوڑ کر آؤں گا۔ ایسی گند کی پوٹ کو میں ایک منٹ اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تیرے یاروں سے بھی نبڑ (نبٹ) لوں

گا۔"

وین چل پڑی تھی۔ کانوں میں سیسہ اترتے والا محاورہ اس نے سن رکھا تھا مگر اس کی سماعت نے جو کچھ سہا تھا، وہ پگھلے ہوئے سیسے سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کے باوجود اس کے کان اب تک سن سکتے تھے..... ٹائروں کے سڑک پر لڑھکنے کی آواز..... ٹائروں کے نیچے آ کر اطراف میں اچھلتے ہوئے کنکروں کی آواز..... عجی کے تنفس کی تیز آواز..... اسے سب سنائی دے رہا تھا۔

نہ جانے وہ کون سی جگہ تھی جہاں جا کر گاڑی کے ٹائروں کی حرکت تھم گئی۔ اس نے عجی کے ہاتھ کو دروازے کا ہینڈل کھینچتے دیکھا، پھر عجی نے اسے بازو سے پکڑ کر نیچے دھکا دے دیا تھا۔ وہ خود کو گرنے سے روک نہیں سکی تھی۔ ہتھیلیاں زمین پر ٹکانے سے قبل اس کی ٹھوڑی پوری قوت سے پختہ زمین سے ٹکرائی تھی۔ اسے لگا جیسے گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ اس کے منہ میں خون کا کسیلا ذائقہ تھا۔ ریورس ہوتی ہوئی وین کے ٹائروں سے اڑنے والی گرد نے اسے لپیٹ میں لے لیا تھا۔

✠ ✠ ✠

سفر اتنی تیزی سے بیت رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھے ہاتھ سڑک کو پچھلی سمت میں کھینچ رہے ہوں۔ سڑک کسی سرمئی قالین کی مانند تیزی سے سمٹتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جس قدر تاخیر کی خواہش مند تھی، فاصلہ اسی قدر تیزی سے طے ہو رہا تھا۔

پلک جھپکنے کے عرصے میں مناظر بدل جاتے۔ کیکر، شیشم اور سنبل کے پیڑ پیچھے سرک رہے تھے۔ بیہ کے دھوپ جلے، اجاڑ گھونسلے خالی کشکولوں کی مانند ڈالیوں سے جھول رہے تھے۔ پرندے انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ امربیل نے درختوں کے تنوں اور شاخوں کے گرد زرد جالے تان رکھے تھے۔

جاگووالہ میں بانس کے گھنے جھنڈ تھے، ڈال سے ڈال ملی ہوئی، پتے سے پتہ جڑا ہوا۔ وہ کسی ایسے ہی بانس کے جنگل میں چھپ جانا چاہتی تھی جہاں کوئی سوال کرتی آنکھ اسے دیکھ نہ پائے، اجالے کی ایک بوند اس تک نہ پہنچ سکے، ہوا کا ایک جھونکا اسے چھو کر نہ گزرے مگر بانس کے جھنڈ گزر گئے، وہ خود کو ان میں گم نہ کر سکی۔ وہ بس کی نشست پر بیٹھی رہ گئی تھی۔ لوگوں کی نظروں کے سامنے..... روشنی اگلتے سورج کے نیچے..... بدن کو جھلساتی ہوا کے گھیرے میں.....

مالٹے اور آم کے باغات دور بھاگ رہے تھے۔ ایک کچی پکی قبروں سے پر قبرستان اس کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ اچانک بس رک گئی۔ شاید کوئی اسٹاپ آ گیا تھا۔

"کاش بس یہیں رکی رہے۔ اس مقام سے ایک انچ آگے نہ سرکے۔" اس نے حسرت سے سوچا تھا۔

قبرستان کے ساتھ پیلو کے درختوں تلے چند کتے ایک مردہ جانور کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ ان کی تھوتھنیاں اور پنجے خون آلود تھے، ان کے نوکیلے دانتوں اور لٹکتی ہوئی زبانوں سے گلابی

چیتھڑے چمٹے تھے۔ اتنے فاصلے سے بھی وہ ان کے حلق سے نکلنے والی غراہٹوں کو بخوبی سن رہی تھی۔ ان کے جسموں سے اٹھتا تعفن اس کے تنفس سے الجھ رہا تھا۔

بس وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ گندم کے بھورے پودے، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں، گدلے پانی کے جوہڑ، کچے پکے مکانات دور بھاگ رہے تھے۔ وہ حیران تھی کہ گھنٹے، لمحوں میں کیسے بدل گئے، وقت کی رفتار اتنی تیز کیوں ہوگئی؟ سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر وہ نتھنوں سے باہر بھی نکالنے نہ پاتی کہ اگلا گاؤں آ جاتا۔ پہلو بدلنے کا سوچ رہی ہوتی کہ نور پور جٹاں، شام کوٹ میں تبدیل ہو جاتا۔ بس ڈھلان سے پھسلے ہوئے پتھر کی طرح لڑھک رہی تھی۔ پھر کوٹ بسم اللہ بھی آ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر ایسا کرنے سے کیا ہوسکتا تھا۔ اگلے پل جب اس نے آنکھیں کھولیں تو بس اس مختصر پاٹ کی نہر پر سے گزر رہی تھی جس کی پلیا کے دائیں طرف کیلے کا جھنڈ ٹیالے پانی پر جھکا ہوا تھا۔ بدرنگ پانی میں ڈوبے ہوئے کیلے کے پتلوں کو اس نے خوف آمیز تحیر سے دیکھا تھا۔ پھر کوئی جادو کی چھڑی گھومی اور وہ ریلوے پلیٹ فارم پر اگے ہوئے برگد کے معمر درخت کے گھنے سایے تلے پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ عجی اس کا اٹیچی گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔

اب وہ سنبل کے نارنجی ڈوڈوں سے لدے پیڑ اور گل عباس کے کاسنی پھولوں والے جھاڑوں کو دیکھ سکتی تھی جو ان کے گھر کی کچی دیوار کے ساتھ لپٹے تھے۔ قیف رو پھول اٹھی ہوئی انگلیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

✠ ✠ ✠

اس نے ایک جھٹکے سے پردے سمیٹ دیئے۔ بھیگی صبح نے اوک میں روشنی بھر کر اس کی مانگ میں انڈیل دی۔ املتاس کے شگوفوں کا اجلا زرد رنگ سورج کی اولین کرنوں میں نکھر رہا تھا۔ ڈالیوں پر بیٹھی شیامہ چڑیاں بھیگے پروں کو سکھانے کے لیے رہ رہ کر جھرجھریاں لیتی تھیں۔ موگرے کی سپید کلیاں، کینا کے لال پھول، بوگن ویلیا کی کاسنی پتیاں، انار کے گلابی شگوفے نم ہوا کی چھیڑ سے مچل رہے تھے۔ پھولوں کی پتیوں پر ٹھہری ہوئی شفاف بوندیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔

رات بھر پھوئیاں برسی تھیں اور ہر شے نئی رنگت، نیا پیراہن اوڑھ چکی تھی۔

اس کے دل کے کسی گوشے میں مبہم سے احساس نے کروٹ لی۔ اس کی مٹھیاں زور سے

بھنچ گئیں اور پیروں کے تلوؤں میں ہلکی سی جلن محسوس ہونے لگی۔ یہ بہت بے چین کر دینے والی واردات تھی۔ اس وقت اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے جس سے وجود پر چھایا ہوا اضطراب کا غبار چھٹ جائے۔ پھیپھڑوں کی تمام قوت صرف کر کے اتنی زور سے چلائے کہ املتاس کی شاخوں پر بیٹھی چمک دار، سیاہ پروں والی چڑیاں پھُر سے اڑ جائیں اور دیر تک اس چیخ کی بازگشت ہوا میں مجسم رہے یا مغربی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پتھر کا بڑا گل دان، جس میں لاجونتی کا پودا خوابیدہ پتیوں کے ساتھ سر نیہوڑائے کھڑا تھا، اٹھا کر کھڑکی کے شیشے پر دے مارے اور کانچ کرچی کرچی ہو کر فضا میں بکھر جائے یا کم سے کم گلا پھاڑ کر ایسا زوردار قہقہہ لگائے کہ گردن کی رگیں پھٹنے لگیں، کھانسی کا ایسا دورہ پڑے کہ سانس الٹ جائے، آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔ کنپٹیاں مسلتے ہوئے مڑ کر اس نے اونیل کے چہرے کو دیکھا تھا۔ اسے لگا وہ پلکوں کی جھری سے اسے دیکھ رہا تھا۔

انہیں ملتان آئے ہوئے پانچواں روز تھا اور گزشتہ چار دنوں کا بیشتر وقت اونیل نے گھر سے باہر گزارا تھا۔ پچھلی رات بھی وہ ایک بجے کے قریب لوٹا تھا اور آتے ہی بے سدھ ہو گیا تھا۔ نہ تو اس نے مصروفیت کی وجہ دریافت کی تھی اور نہ ہی اونیل نے خود کچھ بتایا تھا۔ وہ پورا دن ویران گھر میں بھٹکتی رہتی۔ رات گئے تک خالی کمروں اور اجاڑ غلام گردشوں میں چکراتی پھرتی۔ کہیں بھی چین سے ٹکنے نہ پاتی ہر جگہ اس کے تعاقب میں کوئی ہوتا۔ کوئی ایسا جو بے قدموں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اسے لگتا کہ کسی بھی لمحے اسے کندھوں سے دبوچ لیا جائے گا۔ وہ ڈرتی رہتی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک سفر کرتی رہتی۔ اعصاب شل ہو جاتے تو ستانے کے لیے کہیں بیٹھ جاتی۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی، ایک شبیہہ ذہن میں لہرانے لگتی۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ جن کی رنگت رات سے زیادہ گہری تھی۔ سہمی ہوئی آنکھیں، دہشت سے پھٹی ہوئی، حیرت سے پھیلی ہوئی سیاہ آنکھیں اس کے پپوٹوں سے چپک جاتیں۔ وہ ان آنکھوں کو سوچنا نہیں چاہتی تھی، مگر وہ اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتیں۔ اس کے تصور میں ناچتی رہتیں۔ اسے کچھ یاد دلاتی رہتیں، اسے لگتا اس کا دل مٹھی میں لے کر مسلا جا رہا ہے۔ پوری رات وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ پاتی۔

یہ گھر اونیل کے کسی جاننے والے کا تھا۔ کچھ عجیب طرز سے تعمیر کیا گیا تھا۔ تنگ تنگ

راہداریاں اور کمرے ہی کمرے جیسے کھیال (شہد کا چھتہ) میں رخنے ہوتے ہیں۔ کمروں کی چھتیں نیچی تھیں۔ اور اکثر میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ ایک کمرے میں زنگ آلود لوہے کی الماریاں رکھی تھیں جن میں بہت سی کتابیں، رسائل، خطوط اور فائلیں ٹھونسی ہوئی تھیں۔ پچھواڑے ایک مختصر سا لان تھا۔ جس میں بے شمار چھوٹے بڑے پودے اور درخت ایک دوجے سے گتھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ درختوں کے بیچ اتنا کم فاصلہ تھا کہ شاخیں آپس میں الجھتی تھیں۔ لان کے وسط میں شیشم کے دو ٹھنٹھ یوں لپٹے ہوئے تھے جیسے دو دیو ہیکل چھپکلیاں بغل گیر ہوں۔ گھر کا مجموعی تاثر گھٹن طاری کر دینے والا تھا۔

اونیل نے یہاں آتے ہی ایک ملازمہ کا بندوبست کیا تھا جس نے دو تین کمروں کو صاف کر کے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہاں رہا جا سکے۔ وہ ہی ان کے لیے کھانا پکاتی تھی۔ شام تک وہ جاشیہ کے ساتھ رہتی۔

کچھ فرنیچر پہلے سے موجود تھا اور کچھ سیکنڈ ہینڈ چیزیں اونیل نے ایک قریبی شوروم سے خرید لی تھیں۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں کافی زیادہ عرصے تک یہیں ٹھہرنا تھا۔ پہلی تین راتیں تو اونیل نے گھر سے باہر گزاری تھیں۔ اس نے ملازمہ کو رات ٹھہرانے کی بہت کوشش کی مگر وہ آمادہ نہ ہوئی۔ یہ تین راتیں اس نے بڑی مشکل سے بسر کی تھیں۔ بار بار اٹھ کر کھڑکی سے باہر آسمان پر سپیدی کے آثار ڈھونڈتی رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر سہم جاتی تھی۔ کوئی ان دیکھے ہاتھ دروازوں پر دستکیں دیتے رہتے۔ کوئی غیر مرئی قدم غلام گردشوں میں بھٹکتے رہتے۔ ان کی چاپ اس کے دل کی زمین پر گونجتی۔ ان کا لمس نبض کے ساتھ دھڑکتا۔ خوف سے اس کی رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہونے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ اونیل کے آنے کے بعد یہ خوف دور ہو جائے گا مگر جب چوتھی رات وہ اس کے قریب بیڈ پر لیٹا تھا تو وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر خوف زدہ تھی۔ ساری رات وہ بیڈ کے سرے پر ٹکی رہی۔

اونیل کے سانس لینے کی آواز ان مبہم آہٹوں سے زیادہ پریشان کن تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن شل ہونے لگا تھا۔ اس کے سامنے دھند تھی، ایک وسیع خلا تھا۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اونیل کو چھوڑنا اس کے بس میں نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ رہنا بھی ممکن نہیں لگتا تھا۔

اونیل کے خوابیدہ چہرے سے نظر ہٹا کر وہ آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''کتنا اچھا لگتا ہے، صبح آنکھ کھلتے ہی تمہیں دیکھنا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے، تم بچے کی وجہ سے پریشان ہو۔ میں اسی سلسلے میں انتظامات کرنے میں مصروف تھا۔ چند دنوں میں ہم شادی کر لیں گے۔''

''شادی کر لیں گے؟'' وہ چونک کر مڑی۔

''ہم چرچ میں شادی کریں گے۔'' اس نے آرام سے بتایا۔

''چرچ میں شادی کریں گے۔'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''ہماری شادی تو ہو چکی ہے۔ ہم دونوں مسلم ہیں۔ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''وہ تو ہے..... میں مسلم ہونے سے مکر تو نہیں رہا۔ بچے والا مسئلہ اگر بیچ میں نہ ہوتا تو میں کچھ عرصہ اور اس شادی کو چھپائے رکھتا۔ میں نے ڈیڈی سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہے اور انہوں نے دو ماہ بعد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں چاہتا تھا اس سے پہلے ہم اپنی شادی کو پوشیدہ رکھیں۔ مگر اب تو مجبوری ہے۔ شادی تو ڈکلیئر کرنا ہی پڑے گی ورنہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ ڈیڈی کے اتنے خیر خواہ ادھر موجود ہیں کہ جیسے ہی میں مذہب کی تبدیلی اور شادی کا اعلان کروں گا۔ سارا معاملہ ان تک پہنچ جائے گا۔ اس کا حل میں نے یہ سوچا ہے کہ فی الحال ہم چرچ میں شادی کر لیتے ہیں۔ شادی کی تصاویر اور ایک معافی نامہ ڈیڈی کو بھجوا دیں گے۔ تمہارے بارے میں بتا تو پہلے ہی رکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تھوڑی بہت ناراضی دکھا کر مان جائیں گے۔ ہمارے بچے کو قانونی حیثیت بھی مل جائے گی اور میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔ اس کے بعد ہم.....''

''اس کے بعد کیا؟ اس کے بعد تمہیں پراپرٹی میں حصہ چاہیے ہوگا اس کے لیے تم اپنے ڈیڈی کی ڈیتھ کا انتظار کرو گے۔''

''یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟'' وہ بستر سے اتر کر اس کے مقابل آ گیا۔

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں پتا ہے کہ میں مسلم ہوں۔ میں نے تمہارے لیے اپنا مذہب تک چھوڑ دیا، تم اتنا سا سمجھوتا نہیں کر سکتیں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کتنے مسائل کھڑے ہو جائیں گے اگر میں اٹھ کر اعلان کر دوں کہ..... تمہیں کس ڈر کس بات کا ہے؟ چرچ میں شادی کی

حیثیت ایک ڈرامے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس سے ہمارے عقیدے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد میں پراُمس کرتا ہوں، ہم ایز مسلمز زندگی گزاریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگے گا مگر مجبوری ہے۔ فی الحال ہمیں یہ کرنا ہوگا۔''

وہ جاشیہ کو شانوں سے تھام کر اسے حالات کی نزاکت اور مصلحت کوشی کی اہمیت سمجھاتا رہا۔

وہ فرش پر بچھے کارپٹ کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر باہر آ گئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اچانک رقم کی ضرورت کس لیے پڑ گئی ہے۔ ریسٹورنٹ کا بزنس اچھا خاصا چل رہا تھا اور جہاں تک اس کے علم میں تھا، وہاں سے ہونے والی آمدن ان کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

''شام کو تیار رہنا۔ میں تمہیں شہر کے بہترین ٹیلرنگ شاپ پر لے کر جاؤں گا، تمہارے ویڈنگ ڈریس کا ناپ دینے کے لیے۔'' باہر نکلتے ہوئے اس نے اونیل کو کہتے سنا تھا۔

کچن کی پرحدت فضا پراٹھوں، تلے ہوئے انڈوں اور بھنے ہوئے قیمے کی خوشبو سے لبریز تھی۔ عالیہ نے اسے دیکھ کر ناشتے کے لیے پوچھا لیکن اسے بھوک بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اونیل کو چائے پہنچانے کی ہدایت دے کر وہ لان میں نکل آئی۔

اسے کسی رقم اور کسی پراپرٹی سے غرض نہیں تھی، جرمنی میں بیٹھے ہوئے ڈیڈی کی کوئی پروا نہیں تھی، کمیونٹی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی، مسئلے کی گمبھیرتا کو وہ نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ اسے وہی کرنا تھا جو اونیل نے کہا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

اور کچھ روز بعد چرچ میں مسیحی عقیدے کے مطابق اس کا نکاح اونیل سے ہو گیا۔ اسے اونیل کے پہلو میں بائیں طرف بٹھایا گیا۔ فادر نے اس سے رضامندی لے کر اونیل سے اس کی مرضی معلوم کی۔ ان دونوں نے انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا۔ اسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا ''ریت بیل'' پہن کر جب اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تھا تو اپنا وجود یکسر اجنبی محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی اور کو آئینے میں دیکھ رہی ہو، جیسے وہ بہروپ بھر کر کسی کو دھوکا دینا چاہتی ہو۔

چرچ کے ماحول میں اپنا آپ اسے یوں نظر آتا تھا جیسے راج ہنسوں کے غول میں کوئی

کونج آن بیٹھی ہو۔

اونیل کے چند دوست بھی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں شیراز بھی تھا۔ جاشیہ کو مبارک باد دے کر جب اس نے تحفہ دینے کی کوشش کی تو اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شیراز کا منہ نوچ لے۔ اونیل نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھ کر پرسکون رہنے کی ہدایت کی لیکن وہ خود پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ سارا وقت وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکانے میں کوشاں رہی مگر آنکھوں کی نمی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ گھر آ کر وہ باتھ روم میں بند ہو کر دیر تک روتی رہی تھی۔

اگلے چند روز بہت مصروفیت میں گزرے۔ دعوتوں اور میل ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اوکاڑہ کینٹ سے پہلے اونیل کی فیملی اسی شہر میں رہتی تھی اور بہت سے جاننے والے یہاں موجود تھے۔ انہیں کئی لوگوں نے مدعو کیا تھا۔ اونیل نے چند منتخب لوگوں کی دعوت قبول کر کے باقی سے معذرت کر لی۔

وہ چپ چاپ اس کے ساتھ جاتی رہی۔ دعوت میں شریک ہونے کے لیے جس لباس کا انتخاب وہ کر دیتا، وہ خاموشی سے پہن لیتی۔ ان دنوں اونیل خاص طور پر اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا، ہر بات میں اس کی رائے لیتا، اسے شاپنگ کے لیے سارے شہر میں گھماتا، اس کی پسند کو ترجیح دینے کی کوشش کرتا مگر وہ پتھر کی مورت بن گئی تھی۔ ہجوم کے درمیان بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے خلا میں گھورتی رہتی۔ محفل میں قہقہے گونج رہے ہوتے اور وہ ناخن کترتی رہتی۔ اونیل اس سے کوئی بات کرتا تو یوں چونک جاتی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔ اس کی بھوک بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بے خوابی کا شکار رہنے لگی تھی۔ رات میں کئی بار اٹھ کر دیکھتی کہ کھڑکی بند تو نہیں ہے۔ دم گھٹنے کی شکایت کرتی۔ گردن مسلتے ہوئے کھانسنے لگتی۔ رات کے کسی بھی پہر اونیل پانی پینے یا باتھ روم جانے کے لیے اٹھتا تو وہ جاگ رہی ہوتی۔

اس رات بھی اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ سلیپنگ پلز کی دی ہوئی نیند کا بوجھل پن اس کے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر بستر کے دوسرے سرے پر اوندھے لیٹے اونیل پر ڈالی اور چادر کو جسم پر درست کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن خاصی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند آنکھوں میں آنے پر راضی نہ ہوئی تھی۔ اسے حرارت

کا احساس بھی ستانے لگا تھا۔ اس نے چادر کو بدن پر ذرا سا نیچے کھسکا دیا اور کمر کے بل چت لیٹتے ہوئے چھت کے پنکھے پر نظریں جما دیں۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی جس میں اکثر چیزوں کی غیر واضح پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دیواروں سے لپٹی زرد، مضمحل روشنی کو دیکھنے لگی۔ یکبارگی دو آنکھیں اس کے تصور میں آ گئیں۔ دہشت سے پھٹی ہوئی ان آنکھوں میں ایک مخصوص رنگ منجمد تھا۔ اسے لگا وہ کسی مرے ہوئے شخص کی آنکھیں تھیں اور وہ رنگ موت کا تاریک رنگ تھا۔

اس نے ان آنکھوں کے تصور سے دامن چھڑانے کے لیے سختی سے آنکھیں میچ لیں لیکن بند آنکھوں میں ان کا عکس مزید وضاحت کے ساتھ در آیا تھا۔ خوف اور اضطراب اس کی روح پر چیونٹیاں بن کر رینگنے لگے۔ وہ آنکھیں بدن کو چھیدتی ہوئی روح کے آر پار ہوئی جاتی تھیں۔ حرارت کا احساس دوچند ہو گیا تھا۔ اس نے چادر کو جھٹک کر پرے پھینک دیا۔ کمرے میں اتنا حبس تھا کہ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے گردن مسلتے ہوئے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے کے لیے ایک بہت گہرا سانس لیا۔ اس کوشش میں اسے کھانسی آ گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کمرے کی تمام ہوا کسی نے کشید کر لی تھی اور اتنی ہوا بھی میسر نہیں تھی جس سے وہ چند سانسیں لے سکے۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔

دبیز قالین پر بے ترتیب قدم رکھتی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی اور دروازے کو مجنونانہ انداز میں کھول کر باہر آ گئی۔ وہ اس کمرے میں نہیں رہ سکتی تھی جہاں دیواروں پر ان آنکھوں کے ان گنت عکس متحرک تھے۔ مردہ آنکھوں کے زندہ عکس، وہ چند لمحے دیوار سے ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لیتی رہی اور پھر تاریکی میں ڈوبی خاموش، خوابیدہ غلام گردشوں میں چکرانے لگی۔ ایک کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے آتی سیل فون کی بیپ سن کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ اس کمرے کو وہ ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور اونیل شاید لباس تبدیل کرتے ہوئے اپنا سیل فون یہیں بھول گیا تھا۔ بلب جلا کر اس نے سیل فون کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، وہ بیڈ پر بکھرے کپڑوں کے درمیان پڑا ہوا مل گیا تھا۔

کال کرنے والی کوئی غیر ملکی عورت تھی، جو ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات کر رہی تھی۔

''اونیل کو فون دیں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں ان کی بیوی ہوں۔''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ''اونیل نے شادی کر لی ہے؟ حیرت ہے اس نے بتایا ہی نہیں۔''

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' اس نے الجھ کر پوچھا تھا۔

''میں آنجہانی جان پیٹر کی بیوہ بات کر رہی ہوں۔''

''اونیل کی سوتیلی ماں۔ آنجہانی جان پیٹر.....'' اسے لگا وہ اب تک نیند میں ہے۔

''میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ فوراً اونیل کو بلا دیں۔'' دوسری طرف سے قدرے جھنجھلا کر کہا گیا۔

''اونیل کے ڈیڈی مر گئے ہیں؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟'' آواز میں شدید حیرت تھی۔

''عجیب بات ہے اونیل نے آپ کو نہیں بتایا۔ ان کو مرے ہوئے تو آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔''

اس کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ چھت کا ساکت پنکھا اپنی جگہ سے جدا ہو کر ڈولتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ اسے لگا، وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔

''کیا آپ فون پر موجود ہیں؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے پوچھا گیا۔

''اونیل گھر میں نہیں ہے۔ آپ کو کوئی پیغام دینا ہے تو مجھے بتا دیں۔'' اپنی پشت پر دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے بمشکل کہا تھا۔

''اونیل کو بتا دیجیے گا میں اگلے ماہ پاکستان آ رہی ہوں۔ جائیداد کے معاملات طے کرنے کے لیے۔ میں بہت دکھی ہوں، اونیل کو سمجھائیں وہ مجھے پریشان نہ کرے۔ مجھے اس کی جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو کچھ بھی اس کے نام ہے وہ اسی کا ہے، آمنے سامنے بیٹھ کر سارے مسائل حل کر لیے جائیں گے۔ میرے ساتھ جس لہجے میں بات کرتا ہے وہ بالکل مناسب نہیں۔ میری بیٹیاں اس کے باپ کی ہی اولاد ہیں اگر انہیں کچھ مل رہا ہے تو یہ ان کا حق ہے۔''

نہ جانے وہ کیا کچھ کہہ رہی تھی جاشیہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ رابطہ منقطع ہونے کے بعد

کانپتی انگلی سے اس نے کال کو ہسٹری سے حذف کیا اور سیل فون کو واپس اسی جگہ رکھ کر زمین پر ڈھے گئی۔

''اونیل نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے ڈیڈی کے خوف سے مسلم ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا۔ اس کے ڈیڈی نہیں ہیں تو..... وہ..... اس کا مطلب ہے وہ مسلمان نہیں ہوا۔ وہ اپنے مذہب پر قائم ہے اور اس نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ میں غیر مسلم ہو چکی ہوں۔ میں مسلمان نہیں رہی۔ سب لوگ مجھے میری کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نے نکاح کا ڈھونگ رچا کر مجھے دھوکہ دیا۔ میں سمجھی وہ میرے لیے سب کچھ چھوڑ رہا ہے لیکن اصل میں، میں اس کی خاطر سب کچھ چھوڑتی رہی۔ میں نے سب کو چھوڑ دیا۔ اپنی ماں کو، اپنے نام کو اور حتیٰ کہ اللہ کو بھی۔ اونیل نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس نے مجھے برباد کر دیا۔ میں ایک عیسائی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔''

حلق سے نکلتی کراہوں کو روکنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ دھاڑیں مار مار کر روئے، اپنے بال نوچ لے لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اونیل دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔

''تم اب تک جاگ رہی ہو؟ اس طرح فرش پر کیوں بیٹھی ہو؟'' اس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر ایک مختصر نگاہ اس پر ڈالی اور خاموشی سے اٹھ گئی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے لگا تو وہ غیر محسوس طور پر اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔

اسے لگ رہا تھا وہ کسی عفریت کے ساتھ قفس میں قید ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں شدید سہم بیٹھ گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

عجی اسے چھوڑ کر فوراً ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اماں، ابا نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا۔ عائشہ کی غیر متوقع آمد کا سبب پوچھنے پر عائشہ کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس نے کہا تھا۔ ''چاچا کالج میں چھٹیاں شروع ہونے میں کچھ دن رہ گئے ہیں۔ پڑھائی وڑھائی تو ہوتی کوئی نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا، اسے چھوڑ آؤں۔ بعد میں میرے پاس وقت

نہیں ہوگا، میں اپنا تبادلہ کمپنی کے ہیڈ آفس لاہور میں کرانے لگا ہوں۔ پھر اسے لینے کے لیے تجھے خود آنا پڑتا۔ میں نے سوچا تو کہاں کھجل خوار ہوتا رہے گا۔''

تایا جان کو بھی اس نے اسی سے ملتا جلتا جواب دیا تھا۔ بمشکل چند منٹ ابا کے پاس بیٹھ کر وہ چلا گیا تھا۔

تاندلیانوالہ سے آپا آئی ہوئی تھی، اس کی اڑھائی سالہ بیٹی شہلا عائشہ سے بہت ہلی ہوئی تھی۔ اس کے آنگن میں قدم رکھتے ہی شہلا اس کی گود میں سوار ہو گئی تھی۔ اپنی توتلی زبان میں سوالوں کی ایک طویل فہرست اس کے سامنے مرتب کر رہی تھی۔ ''تھالہ بول، تھالہ بتا تھالہ ہنس نہ۔ تھالہ..... دھمن دھیریاں تریں..... اوں ہوں..... بول نا..... اوں ہوں.....'' اسے چپ دیکھ کر وہ ٹھنکنے لگی۔

آپا بولی۔ ''کیا بات ہے؟ زیادہ تھک گئی ہے۔ بڑی چپ چپ ہے۔''

''ساتھنیں (سہیلیاں) ادھر رہ گئیں، دل اداس ہوگا۔ دو تین مہینے جو پڑ گئے بیچ میں۔'' ابا ادوائن کھینچتے ہوئے مسکرائے۔

''عیشو! مجھے تیرا منہ سوجا ہوا لگتا ہے۔ پرچھانویں (چھاؤں) میں بیٹھی ہے۔ شاید اس واسطے، ادھر ہو ذرا۔'' آپا کی بات سن کر اس نے شہلا کو گود سے اتارا اور اٹھ کر نلکے کی طرف بڑھی۔

اماں بولیں۔ ''نلکا خراب ہے۔ کدی (کبھی) تو صاف پانی آتا ہے۔ بالکل ستھرا تو کدی مٹی گارا نکلن (نکلنے) لگتا ہے۔ منہ ہتھ ٹوٹی (ٹونٹی) سے دھولے، کنیز موٹر چلا دے ٹھنڈا پانی نکلے ذرا۔ ٹینکی کا پانی تو اگ ورگا تتا (آگ جیسا گرم) ہوگا اج تو سیک (گرمی) وی اخیر کا ہے۔'' کنیز نے پانی کی موٹر چلا دی۔

''اماں! میں نہا لیتی ہوں، میرا جی گھبرا رہا ہے۔''

''لے اس میں پچھن والی کیا بات ہے، بڑی سوہنی گل (بات) ہے نہا لے۔ طبیعت ہولی (ہلکی پھلکی) ہو جائے گی۔ کنیز! عیشو کو نویں (نئی) گاچی صابن کی نکال کر دے۔''

عصر کے وقت کنیز اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور کالج کی، تایا جی کے گھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی تھی۔

''اماں تیرے بیاہ کی تیاریوں میں لگی ہے۔ چار ریشمی جوڑے تو خرید بھی لیے ہیں،

گنگا جمنی لیس لگا کر ایک بڑا سوہنا دوپٹہ میں نے تیار کیا ہے۔ دکھاؤں لا کر؟''

''نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔''

''جستی ٹرنکوں اور پیٹیوں کا بیعانہ بھی پکڑا آیا ابا۔ اس بار موسم میں بستروں کے لیے کپاہ (کپاس) بھی خرید لیں گے۔''

''استانی صغریٰ کی بیٹی اب ٹھیک ہے؟'' اس نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

''ہاں۔ بھلی چنگی ہوگئی، کب کی۔ اب تو اسکول بھی آنے لگی ہے۔ عیشو! صابن کے ساتھ تو نے کیا کیا ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ذری سا باقی رہ گیا ہے۔ پیکٹ سے نکال کر نواں ٹکور تجھے پکڑایا تھا۔ اب جو دیکھا ہے تو آدھے سے زیادہ کھر (گھل) گیا ہے۔ تو نہاتی رہی ہے یا صابن کھانے لگی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، پورے دو گھنٹے تو غسلخانے میں رہی ہے۔''

وہ چپ رہی تھی۔

''میں تیری شادی پر.....''

''رات کو کیا پک رہا ہے آج.....؟''

''بڑی اکھڑی اکھڑی ہے عیشو! آپا کے پاس بھی نہیں بیٹھتی، خیر تو ہے، تائی نے کچھ کہہ دیا ہوگا۔ وہ ٹچکریں (طنز) کرنے سے باز نہیں آتی۔''

عائشہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اسے نہیں پتا تھا، یہ کوشش اس کا بھید کھول دے گی۔

''تو رو رہی ہے؟'' کنیز تڑپ کر بولی۔ ''کیا ہوا۔ روتی کیوں ہے؟''

''میں کیوں روؤں گی بھلا؟ رونے کی کوئی وجہ بھی ہو۔ پتا نہیں آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

کنیز کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

''عجی بھی ناراض سا لگتا تھا۔ دو گھڑی بھی نہیں ٹکا۔ اس کے ساتھ لڑائی ہوگئی ہے؟ عیشو! بتاتی کیوں نہیں، کیوں روئے جاتی ہے؟ کوئی بات تو ضرور ہوئی ہے۔''

اس نے آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا اور بھیگی آواز میں بولی۔

''میں ہسٹری کے پرچے میں فیل ہوگئی۔ میں نے بڑی محنت کی تھی۔''

رخساروں پر لڑھکتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے پھسل کر چادر میں جذب ہو رہے تھے۔

کنیز ہنس پڑی۔ ''یہ کوئی رونے والی بات ہے؟ حوصلہ کر، تو نے محنت تو کی تھی ناں، نصیب کے لکھے کو کون ٹالے۔ فیل تو نہیں ہوئی، غیر حاضر ہوئی ہے۔ دل چھوٹا نہ کر۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ اللہ جانے کیا ہوگیا۔ پاگل نہ ہو تو۔''

اس نے ہاتھ کو یوں جنبش دی جیسے اس کی نادانی پر ماتم کر رہی ہو۔ اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اذان شروع ہوگئی۔ موذن لوگوں کو پکارنے لگا۔ اللہ کی طرف آنے کی دعوت دینے لگا۔

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ کسی بلاوے کا جواب اس نے نہیں دیا۔ موذن پکارتا رہا۔ وہ ہونٹوں پر تالا لگائے بیٹھی رہی۔ وہ بلاتا رہا۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی مانند بے حس و حرکت رہی۔

''میں تیرے سامنے نہیں آ سکتی۔ کیسے آؤں، کتنا دھوؤں، خود کو کتنا صاف کروں کہ تیرے پاس آنے کے قابل ہو جاؤں۔ میل ہی میل ہے، گندگی ہی گندگی ہے۔ یہ صابن، یہ پانی کوئی اثر ہی نہیں کرتا۔ میں جتنا بھی پانی بہاؤں، جتنا بھی صابن ملوں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میرے جسم سے چمٹی غلاظت دور نہیں ہوتی۔ خوشبو کے ڈھیر انڈیل لوں تو بھی بو نہیں چھپتی۔ کیسے آؤں تیرے سامنے۔ میں کیا کروں۔''

آپا کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چارپائی پر لیٹ کر سوتی بن گئی۔ ایک بازو اس نے آنکھوں پر رکھ لیا تھا تاکہ آنسو آپا کی نظروں میں نہ آئیں۔ اس کے پاس کسی کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

✠ ✠ ✠

اماں نے کنیز کو پکارا ''جانی مصلا دے آ عیشو کو بھنچے (زمین پر) پڑھے گی نماز۔ مصلا تو لے کر گئی نہیں۔ یہ کڑی تو بڑی ہی جھلی ہوگئی ہے۔ لوگ پڑھ کے تمیز سیکھتے ہیں، طریقہ سلیقہ سمجھتے ہیں اور یہ.....اس پر تو بڑا پٹھا اثر کیا ہے پڑھائی نے۔ کیسی بی بی ہوتی تھی عیشو، جی جی کرتے زبان سوکھتی تھی۔ جب سے گیمبروں واپس آئی ہے، اک وار (بار) میرے کول نہیں بیٹھی۔ کوئی گل نہیں، کوئی بات نہیں۔ بس اک چپ۔ شہلا وچاری (بے چاری) ترلے کرتی پھری اس کے پچھے (پیچھے)۔

اسے وی نئیں بلایا۔ رابعہ ناراض ہو رہی تھی۔ کہن لگی، اماں عیشو میری کڑی کو پوچھتی نئیں، اسے کھڈاتی (کھلاتی) نئیں۔ سارے طور طریقے ای بدل گئے ہیں۔ سنتی اے بگو! یہ وی نئیں پوچھتی کہ تیرے وال (بال) کیسے رکھے ہو گئے ہیں۔ اماں لا تیل ڈال دوں۔"

اماں اپنی مڑے ہوئے سینگوں والی مریل سی بکری کے پاس بیٹھ کر اسے اپنا دکھڑا سنانے لگیں۔

"اللہ جانے کیا ہو گیا ہے عیشو کو۔ پتا نئیں کس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ آپ ہی آپ بولتی ہے، بڑبڑ کرتی ہے۔ کجھ (کچھ) سمجھ نئیں آتی کون ہے جسے سناتی ہے۔ نیڑے (پاس) چلے جاؤ تو فیر (پھر) چپ۔ کجھ بتاتی ہی نئیں۔ یا بیٹھی صابن سے کھیڈتی (کھیلتی) ہے، ہتھ پیروں پہ صابن ملے جاتی ہے، منہ دھوئے جاتی ہے۔ وہمن (وہمی) کیوں ہو گئی ہے؟ اللہ ہی جانے۔ مجھے لگتا ہے نظر لگ گئی ہے عیشو کو۔ رنگ وی کیسا پیلک ورگا ہو گیا ہے۔ جس روز ٹھینگ موڑ جان والی بس پہ بٹھا کے آئی ہوں، جو گیے رنگ کے سوٹ اور مشینی کڑھائی والی کالی چادر میں کیسا لشکیں مارتا مکھڑا تھا۔ میں نے تو سو وار رب سے اس کی خیر مانگی۔ ایسی پھبن ہو تو نظر تو آپ ہی لگ جاتی ہے ناں۔

کتنا روکا میں نے کریم بخش کو، کتنا رولا ڈالا۔ اسے نہ بھیج، بارہ جماعتیں بڑی ہوتی ہیں۔ اتنا بہت سارا پڑھ کے کیا لینا ہے۔ پر مجھ نمانی کی کون سنتا ہے۔ میرے ہکلتے ہکلتے (منع کرتے) وی بھیج دیا۔ اس کی تائی نے کہاں برداشت کیا ہو گا۔ بڑی شومنی (کنجوس) ہے وہ۔ کھان پین کی ساری چیزیں جندروں (تالوں) میں رکھتی ہو گی۔ ددھ (دودھ) دہی کو ترساتی ہو گی۔ تو وی چنگی طرح کھایا کر بگو۔ کریم بخش کہتا ہے، میں تیری سیوائیں کرتی۔ تجھے ویلے سے پٹھے (چارہ) نئیں ڈالتی۔ لے بھلا میں کوئی ایسا کرتی ہوں۔ میں تو اپنے بچوں کی طرح سانبھ (سنبھال) رہی ہوں تجھے۔ اب تو ہی پٹھوں کو منہ نہ لگائے تو میں نصیباں سڑی (نصیبوں جلی) کیا کروں۔"

اماں نے بگو کی ابھری ہوئی پسلیوں پر ہاتھ پھیر کر ٹوٹے ہوئے پیندے والی تگاری قریب کھسکائی اور چارہ اس میں ڈال کر بگو کے آگے رکھ دی۔

"اج کل تو پٹھے ملتے ہی نئیں۔ لوسن (لوسرن) سارا سیک نے ساڑ دیا ہے (جلا دیا ہے)۔ ہائے نی میری ماں۔"

وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کراہتی ہوئی اٹھیں۔

"میں روٹیاں پکالوں، تندور تپ گیا ہے۔ کریم بخش بس گھر آن ہی والا ہے۔"

انہوں نے چند تنکے اٹھا کر تنور کے دہکتے ہوئے دہانے میں اچھالے آگ کے شعلے ایک لمحے کے لیے بھڑک کر ادھ جلی کچی دیوار کے ساتھ اوپر اٹھے اور پھر سر کے بل واپس دہانے میں جا گرے۔ اماں خالی خالی نظروں سے آگ کی حدت سے سرخ کناروں پر کروٹیں بدلتے شعلوں کو دیکھنے لگیں۔

✠ ✠ ✠

اتوار کی صبح نو بجے کے قریب اونیل گاڑی لے کر نکلا تو وہ تیز تیز قدموں سے گلی کے نکڑ پر کھڑی ٹیکسی میں جا بیٹھی جو عالیہ اس کی ہدایت پر کچھ دیر پہلے روک کر آئی تھی۔ ڈرائیور سے اس نے اونیل کی گاڑی کا تعاقب کرنے کو کہا تھا اور اس کے تذبذب بھرے انداز کو دیکھ کر ایک بڑا نوٹ اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ نوٹ جیب میں ڈالنے کے بعد وہ کسی قسم کا سوال کیے بغیر اونیل کا پیچھا کرنے لگا تھا۔

وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک کیتھیڈرل کے سامنے رک گیا تھا۔ جاشیہ نے اڈتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل واپس دھکیلتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا اور کیتھیڈرل کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

اونیل باہر نکلا تو وہ دعاؤں کی کتاب کو جیب میں ڈال رہا تھا۔ اس کے ساتھ فادر بھی تھے۔ وہ دروازے میں ٹھہر کر کچھ دیر ان سے بات چیت کرتا رہا۔ پھر اپنے سامنے صلیب بنا کر جھک گیا۔ جاشیہ کی سانسوں میں ریت اڑ رہی تھی۔ سانس لینا دشوار تھا۔ اس نے جنگلے کی سلاخوں کو اتنی شدت سے گرفت میں لیا کہ ہتھیلیوں پر سرخ لکیریں کھنچ گئیں۔

اونیل گاڑی میں بیٹھ کر واپس جا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ تھمی رہی۔

''وہ عیسائی ہے تو میں اس کے ساتھ کس حیثیت سے رہ رہی ہوں؟ طوائف یا داشتہ..... اس کے ساتھ میرا نکاح نہیں ہوا۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ وہ میری خدمات کے عوض مجھے آسائشیں فراہم کرتا رہا۔ طوائف کا کام یہ ہی ہوتا ہے۔ دل بہلانا اور معاوضہ لینا۔ میں یہی تو کر رہی ہوں۔ میں تو گٹر میں گری ہوں۔ سر سے پیر تک لتھڑ گئی ہوں۔ میرا بچہ..... ناجائز بچہ..... میں اپنے پیٹ میں حرامی بچہ لیے پھرتی ہوں۔ میں کیا ہوں؟ میں نے اونیل کو حاصل کرنے کے لیے

اپنے پاؤں کٹا لیے اور مجھے کیا ملا؟ میں کس شے کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگتی رہی؟ میری بینائی کیوں چھن گئی تھی؟ میں نے محبت کی ہے؟ یہ محبت ہے؟..... اگر یہ محبت ہے تو میں رو کیوں رہی ہوں۔ مجھے ملال کس بات کا ہے؟ محبت تو مل گئی مجھے۔ اور کیا چاہیے؟ یہی مانگتی تھی میں۔ مل تو گئی، اب دکھ کس لیے ہے؟''

وہ سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے بہت دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ پاس سے گزرنے والے لوگ اسے عجیب نظروں سے گھورتے رہے مگر وہ ان کی نظروں سے یکسر بے خبر تھی۔ پھر اس نے ایک نظر گرجے کو دیکھا اور کچھ وقت تنہائی میں گزارنے کے خیال سے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

گرجے کی عمارت خاموشی اور تاریکی کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک اس کی نظریں کسی اندھی چمگادڑ کی طرح ادھر ادھر سر ٹکراتی رہیں۔ اسے بے شمار ہیولے اور عجیب وغریب پرچھائیاں اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیتی رہیں۔ لیکن جب اس کی آنکھیں اندر کی نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو سایوں کی حرکت تھم گئی۔ مقدس تصاویر اور مذہبی مجسمے اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہوگئے۔ جانے کس ذہنی رو میں وہ یہاں چلی آئی تھی۔ اندر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے لوٹ جانا چاہیے۔ اس پر خفیف سی گھبراہٹ طاری ہوگی۔ وہ باہر جانے کی نیت سے مڑنے لگی تھی کہ اس کی نظر عشائے ربانی کی میز کے قریب موجود فادر پر پڑی وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔ بے اختیار وہ رک گئی تھی۔

''یہاں آؤ۔'' وہ اسے پکار رہے تھے۔

وہ شش وپنج میں گھر گئی۔

''آگے آجاؤ۔ کس خیال نے تمہیں الجھا رکھا ہے؟''

انہوں نے دوبارہ آواز دی تو وہ ہچکچاتے ہوئے چلی اور بین الصفوف راستے میں سے گزر کر بڑے منبر کے پاس پہنچ گئی۔

''میری بچی! تم کچھ دیر سے آئی ہو۔'' انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''صبح کی سروس کو تمام ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔''

وہ خاموش رہی اور عشائے ربانی کی میز پر ایک مثلث میں جلتی ہوئی شمع کے جھلملاتے

شعلے پر نظر جما دی۔

''تم کچھ پریشان لگتی ہو۔''

اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' فادر اسے ساتھ لیے نشستوں کی پہلی قطار کی جانب بڑھ گئے۔

''ہاں اب بولو تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے۔ میں خداوند کی دی ہوئی قوت سے تمہاری رہنمائی کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر فادر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھ کے گوشے سے ایک آنسو پھسل کر رخسار پر حرارت کا ہلکا سا احساس پیدا کرتا ہوا دوپٹے میں جذب ہو گیا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی۔

''شاباش میری بچی بولو۔ بہادر بنو۔ خاموش رہو گی تو دکھ اور تکلیف دہ ہو جائے گا۔ کہہ دو گی تو دل کو سکون ملے گا۔''

وہ کچھ دیر تک کرسی کے ہتھے پر بے مقصد ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر جھکے ہوئے سر کے ساتھ آہستگی سے بولی۔

''فادر! محبت کیا ہے اور محبت کرنا کیسا ہے؟''

اس کی آواز میں ساحلی ہوا جیسی نمی تھی۔

چند ثانیے وہ خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ان کا چہرہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ وہ مسکرا رہے ہیں۔ اپنے سر پر ان کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اس نے ایک نظر ان کے پرسکون چہرے کو دیکھا تھا۔

''محبت کیا ہے؟'' انہوں نے دھیمی آواز میں دہرایا۔

''اس سوال کا شاید کوئی ایسا جواب میں نہ دے سکوں جو تمہیں حتمی محسوس ہو اور جسے سن کر تمہارا اضطراب تھم جائے۔ بے شمار لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف کی ہے۔ مگر کسی کے الفاظ کو محبت کی مکمل اور آخری definition قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خالق کا ایک راز ہے جس کا سراغ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مخلوق کے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔ مگر بھید نہیں کھلتا اور جب تک

بھید نہ کھلا، جستجو ختم نہیں ہو سکتی۔ ازل سے ابد تک کا سفر اسی جستجو پر محیط ہے۔ کون جانے محبت کیا ہے۔ شاید کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اس کے ہزاروں پہلو اور ہزاروں روپ ہیں۔ کسی ایک روپ کا کھوج لگانے نکلو تو دوسرا روپ نئے امتحان میں مبتلا کر دیتا ہے۔

میں محبت کی تعریف کیا بیان کروں گا۔ میں تو ایک ناقص العقل عام سا انسان ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا یہ کیا ہے اور اس کی اساس کہاں ہے۔ خدا جانے یہ زمین سے پھوٹتی ہے یا آسمان سے برستی ہے، رات کی تاریکی میں چھپی ہے یا دن کے اجالے میں بستی ہے، پھول کے سینے میں پلتی ہے یا کانٹے کی نوک پر رقصاں ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ کائنات کے ایک ایک ذرے کا وجود محبت کے مرہون منت ہے۔ خدا خود محبت ہے اور اس کی ہر تخلیق کا باعث محبت ہے۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر بے حد نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''میری طرف دیکھو میری بچی۔''

اس نے آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھیں ان کے چہرے پر مرکوز کیں تو شفاف قطرے پلکوں سے ٹوٹ کر ملگجے اندھیرے میں کھو گئے۔

''تم نے پوچھا ہے، محبت کرنا کیسا ہے۔ تم نے بائبل کو نہیں پڑھا؟ اگر میں آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولوں اور محبت نہ رکھوں تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ ہوں۔''

انہوں نے نیو ٹیسٹامنٹ کا ایک اقتباس دہرایا۔

''میرے خیال میں تمہارے سوال کا اس سے زیادہ جامع جواب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔''

اس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اس کے جسم کی لرزش اس کی ابتر ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ فادر اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''مت رو میری بچی۔ یسوع تمہاری مدد کرے گا۔ تمہیں غم سے نجات دے گا۔ تم اس کی طرف رجوع کرو۔ وہ اپنے مہربان ہاتھوں سے تمہارے سب دکھوں کو یوں چن لے گا کہ درد کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔''

''فادر مجھے بتائیں۔'' اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ ''مجھے بتائیں، میں ایسی محبت کا کیا کروں جو ایمان کو نگل جائے۔ ایسی محبت جو مجھے فنا کرنے کے درپے ہے۔ ایسی محبت کو کیسے.....''

گلے میں آنسوؤں کے پھندے کے باعث وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی تھی۔ وہ بالکل بے اختیار اور شکستہ دل لگ رہی تھی۔

''غرض ایمان، امید، محبت یہ تینوں دائمی ہیں مگر افضل ان میں محبت ہے۔ محبت کے طالب ہو اور روحانی نعمتوں کی بھی آرزو رکھو۔''

فادر نے ایک بار پھر عہد نامہ جدید کے الفاظ کو ٹھہرے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

''تم بہت دکھی ہو۔ شاید محبت نے کسی ایسے روپ میں تمہاری طرف پیش قدمی کی ہے جو وسوسے میں مبتلا کر دینے والا اور شاید تمہارے لیے ناقابل فہم بھی ہے۔ ابھی تمہارا ذہن الجھا ہوا ہے۔ گھر جاؤ اور پرسکون ہونے کی کوشش کرو پھر آنا۔ شاباش اب تم جاؤ۔''

وہ اٹھی اور آنکھوں کو ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

فادر چند لمحوں تک اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو پرسوچ نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔

''خداوند تمہارے دل کو مضبوطی اور روشنی عطا کرے۔''

انہوں نے سینے پر صلیب بناتے ہوئے اس کے لیے دعا کی اور ایک بغلی دروازے کی طرف چل دیئے۔

وہ فادر کے جانے کے بعد کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر جانے کے لیے مڑی۔ گرجے کے وسطی حصے میں پہنچ کر وہ رکی اور پلٹ کر دیکھا۔ اسے لگا تھا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ منبر کے قوسی سائبان پر جھکی ہوئی سنہری صلیبیں خاموشی سے سر جوڑے ایستادہ تھیں۔ مقدس تصاویر دم سادھے اسے منجمد آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دوبارہ مڑنے لگی تو اس کے کانوں نے ایک مدھم سرگوشی سنی۔

''اور محبت نہ رکھوں تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ ہوں.....''

اس نے بے چینی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہر شے پرسکون تھی۔

''ایمان، امید، محبت یہ تینوں دائمی ہیں مگر افضل ان میں محبت ہے۔'' آواز آرائشی پھولوں اور ڈالیوں سے مرصع سنگی ستونوں اور قوسی چھت سے ٹکرا کر چہار سو بکھر گئی۔

اس بار اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آواز کہاں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ کسی

بت کی طرح اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔

''افضل ان میں محبت ہے.....''

اس کے چاروں اور ایک آواز گردش کرنے لگی۔ اب کلیسا کے ہر گوشے سے ایسی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔

کٹہرے اور اسے ستونوں سے جوڑنے والے پتھر میں نصب شدہ ننھے فرشتے پکار رہے تھے۔

''ٹھنٹھناتا پیتل.....''

میڈونا (کنواری مریمؑ کی شبیہ) کے چہرے کا ایک ایک خط بول رہا تھا۔

''افضل ان میں محبت ہے.....''

''جھنجھناتی جھانجھ.....'' مسیحؑ مصلوب کے ہاتھوں میں گڑی میخیں صدائیں دے رہی تھیں۔

آوازوں کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ آوازیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں۔

''کون سی محبت؟ وہ کیسی محبت ہوتی ہے جس کے بنا انسان ٹھنٹھناتا پیتل ہوتا ہے۔ میں نے وہ محبت کیوں نہیں کی؟ اس محبت کے بغیر میں کیسے زندہ ہوں۔ میں کسے محبت سمجھتی رہی..... وہ محبت کیوں نہیں کی میں نے جو سکون دیتی ہے، جو پناہ میں لیتی ہے۔ میں نے وہ محبت کی جو جلا ڈالتی ہے، راکھ کر دیتی ہے، فنا کر دیتی ہے۔''

اس کی آنکھیں درد میں ڈوب کر نئے سرے سے رسنے لگیں۔ اس کے دل پر منوں وزنی سل دھری تھی۔

اس نے جسم کی چاہ کی تھی اور جسم کی چاہ زعفران کے کھیت جیسی ہوتی ہے۔ دور سے بھڑکتی ہوئی، دور سے لبھاتی ہوئی۔ اس کی شوخ رنگت اور تیز خوشبو دور سے ہی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ سونگھنے والا کھنچا چلا جاتا ہے۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جوں جوں فاصلہ سمٹتا ہے، جوں جوں نزدیکی بڑھتی ہے، خوشبو ناقابل برداشت حد تک تیز ہو جاتی ہے، رنگت آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے، خوشبو کی تندی ایسی ہوتی ہے کہ دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔

انسان وحشت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

محبت تو سفیدے کا پیڑ ہوتی ہے۔ پر شکوہ اور مدھم..... بھڑکتی نہیں، لو بھ نہیں جگاتی، تجسس نہیں ابھارتی۔ پتی پتی خوشبو سے لدی ہوتی ہے مگر خوشبو کی ایک بوند بھی چھلک کر بھید نہیں کھولتی۔ خوشبو ہوتی ہے مگر مستور ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس لگنے پر ہوا میں مشک نافے پھوٹنے لگتے ہیں۔

جو سفیدے کے پیڑ کا مالک ہو، وہ تمام عمر خوشبو میں گھرا رہتا ہے مگر خوشبو ایسی جو آسودگی بخشتی ہے، جو دھیرے دھیرے سہلاتی ہے۔

اس نے زعفران کے کھیت کو چنا تھا اور قربت سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھیں۔ اس کے حواس چھن رہے تھے۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

''پہلے برتن خریدیں یا زیور، اج کل تو برتنوں پر بھی زیور جتنی رقم اٹھ جاتی ہے۔'' اماں نے اپنے سامنے رکھے چند ریشمی جوڑوں اور کڑھے ٹکے دوپٹوں کے ڈھیر کو پولے پولے (نرم) ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے ابا سے کہا۔ چاولوں سے کنکر چنتی کنیز نے آنکھوں میں شرارت بھر کر عائشہ کو دیکھا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ املی کے سائے میں کھاٹ سے ٹانگیں لٹکائے پاؤں کے انگوٹھے سے کچے فرش کو کرید رہی تھی۔

ابا اماں کی بات سن کر ہنسے تھے۔ ''دمڑی نہ بی بی دے پلے۔ ہار لواں کہ چھلے۔ کھیسے میں دھیلا روپیہ ہے نہیں اور بات کرتی ہے زیور کی، پتا بھی ہے سونے کا بھاء (بھاؤ) کیا ہے؟''

''جو بھی ہو کوئی ٹوم چھلہ تو بنوانا ہی پڑتا ہے۔ دھی کو نکوں کنوں بچی (زیور کے بغیر ناک اور کان) تو نہیں ٹور سکتے۔ تو روتا رہ۔ سونے کے بھاء کو، میرے کنوں کی ڈنڈیاں (بالیاں) اور دو کنگن کس دن کام آئیں گے۔''

ابا نے ٹھنڈی آہ بھری ''ان زیوروں سے کیا بنے گا۔ عبدالرحیم نمودیا آدمی ہے، اسے اتنا داج (جہیز) چاہیے جو اس کا گھر بھر دے۔ مجھے تو وہ ڈانواں ڈول لگتا ہے پچھلی بار جب ٹیلی فون پر بات ہوئی تو کہنے لگا۔ کریم بخش جہیز بے شک لعنت ہے پر دنیا کو دکھانے کے لیے کچھ تو ہونا

چاہیے۔ ورنہ لوگوں کی باتیں جینا حرام کر دیتی ہیں۔ ناک نہیں رہتی۔''

اماں نے یوں آنکھیں سکیڑ کر عائشہ کو دیکھا، جیسے ان کی بینائی کمزور ہو گئی ہو۔ پھر روپہلے تاروں والے شنگرفی دوپٹے کا گولہ سا بنا کر گود میں رکھ لیا اور نحیف آواز میں بولیں۔

''تو کوئی غلط نہیں کہتا۔ داج تو دھیوں کے ہی کام آتا ہے۔ سوہروں (سسرال) نے کیا لینا اس سے۔ نویں زمانے میں تو کھکھیڑ (پریشانیاں) ہی بڑے ہیں جب میں دوہٹی بنی تو بند کی دار چھینٹ کی قمیض پہنی تھی۔ اور دوجے دن سوسی کے سوٹ اور ٹسر کے دوپٹے میں تھاپیاں (اپلے) لگا رہی تھی۔ اج کل تو لہنگے غرارے، فراکیں، سونے چاندی کے تکمے (بٹن) لگتے ہیں۔ تو بیچ دے وہ پلاٹ، چار مرلے تھاں ہمارے کس کام کی، دفعہ مار۔''

ابا نے جوتے سے پاؤں نکال کر ٹانگ سمیٹی اور جوتے کو زمین سے ٹکرا کر گرد جھاڑنے لگے۔

''ہم تیاریاں کرتے رہیں اور اگلوں کی مرضی ہی نہ ہو۔ پہلے بات تو صاف ہو جائے۔ عبدالرحیم کی گھر والی ہم سے رشتہ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ تو بھی جانتی ہے اس بات کو۔ عبدالرحیم کی نیت کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ صاف صاف ہاں تو اس نے بھی نہیں کی تو داج بنانے کے پیچھے پڑی ہے۔ برتو ڈھونڈ لے پہلے۔''

''تو فکر کیوں کرتا ہے۔ عجی کو بلا لیتے ہیں ادھر۔ اس کی مرضی ہو تو پھر بات چلائیں گے۔''

''اوناں.....'' ابا جلدی سے بولے۔ ''ناں بھئی، مجھے تو شرم آئے گی۔ میں ایسی بات اپنے منہ سے کیسے کر سکتا ہوں تیری بھی پٹھی مت (الٹی سمجھ) ہے، پڑھی لکھی ہوتی تو کبھی ایسی کملی بات نہ کرتی۔ جاہل جو ہوئی۔ اچھا مشورہ تو نہیں دے سکتی۔''

اماں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

''تو نہ کر نا بات۔ میں کروں گی۔ اسے بٹھا کر پچھن میں کیا حرج ہے۔ اس کی مرضی پتا چل جائے تو بات صاف ہو جائے گی۔ اصل تو اس کی رضا ہے ناں، ہر اٹھوارے (ہفتے) تو وہ آتا ہو گا لاہور سے تو ٹیلی فون پہ اسے آنے کا کہہ دے اور کہنا کہ گھر میں ذکر نہ کرے۔ سیانا منڈا ہے۔ بات کو سمجھ جائے گا۔ بس تو اسی اتوار کو ٹیلی فون کر دے۔'' بکھرے ہوئے کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے

اماں کی توجہ عائشہ کی طرف ہوئی۔

انہوں نے اس کے چہرے پر شرم کی لالی کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کی رنگت اتنی زرد تھی جیسے اس نے چہرے پر ہلدی کا لیپ کر رکھا ہو۔ وہ گیندے کا ایسا پھول دکھائی دیتی تھی۔ جسے ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں قرمزی رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

✠ ✠ ✠

یہ کمرہ ایک طرح سے پرانی اور متروک شدہ اشیاء کا ٹھکانا بن چکا تھا۔ دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ دو ٹوٹے ہوئے جستی ٹرنک اوپر تلے رکھے تھے، جن میں کپڑوں کی بچی کھچی کترنیں، پرانی کتابیں اور ایسے بوسیدہ سوٹ جو قابل مرمت نہ رہے تھے ٹھنسے ہوئے تھے۔ اوپر والے ٹرنک پر سرخ ٹول کی سنجاف لگا مٹ میلا ریشمی کپڑا بچھا ہوا تھا۔ جو اکثر ٹرنک پر سے کھسک کر فرش پر جھولتا رہتا۔ ٹرنکوں کے پہلو میں دو بقچے پڑے تھے جن میں وہ سامان بندھا تھا جو ٹرنکوں میں نہیں سما سکتا تھا۔ دیوار گیری پر اماں کے جہیز کے برتن قطاروں میں رکھے تھے۔ سلور کی کٹوریاں، پیتل کے گلاس، چھوٹے بڑے کٹورے۔ اور بدھنے، تام چینی کی پلیٹیں، کانسی کے مجھولے (دیگچے) ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ سال کا بیشتر حصہ ان برتنوں پر گرد جمی رہتی، جب کبھی اماں کو اپنے ماں باپ کی یاد ستاتی، وہ ایک ایک برتن کو اتار کر لیموں اور ریت سے مانجھ کر چمکاتیں۔ برتنوں کے ڈھیر میں گھر کر بچپن کو یاد کرتیں۔ آنسو بہاتیں۔ اور پھر دیوار گیریوں پر سجا دیتیں۔ ان پر نئے سرے سے دھول کی تہیں جمنے لگتیں۔ ایک گوشے میں باسی روٹیاں پھینکی جاتی تھیں۔ ایک جھلنگا سی چارپائی بھی پڑی ہوئی تھی۔ دوپہر میں کسی کا جی چاہتا تو ادھر آ پڑتا۔ عائشہ دن چڑھے سے شام ڈھلے تک اس کمرے میں چارپائی پر لیٹی رہتی۔ ایک ایک چیز کو گھنٹوں تکتی رہتی۔ کبھی جب اماں اسے اس طرح پڑے دیکھ کر چڑ جاتیں اور جھلا کر بگو پر چلانے لگتیں۔ تو وہ برساتی میں جا بیٹھتی۔ یہ دو جگہیں اس کی پناہ گاہیں تھیں۔

اس روز بھی وہ صبح سے پرانے سامان والے کمرے میں ٹوٹی ہوئی چول والی چارپائی پر لیٹی تھی۔ کاسنی کے مجھولوں پر پچھلے کئی لمحوں سے نظریں جمانے کے باعث اس کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ سارے میں پھپھوندی لگی روٹیوں کی باس اور اس کے کپڑوں سے پھوٹتی تیز خوشبو پھیلی تھی۔

عطر کی مہک اور پھپھوندی کی بو کے اختلاط سے عجب طرح کے مشک نے جنم لیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشوں سے پانی کی پتلی لکیریں کنپٹیوں کی جانب پھسل رہی تھیں۔

''کیا تو کبھی نہ ملے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ میری کسی غلطی نے تجھے ناراض کر دیا ہے۔ میں کیسے تجھے مناؤں، یہ کیسی دیوار بیچ ہے کہ تجھ تک پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیا تو نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے؟ تو کبھی نہ ملے گا؟ میں کتنے اچھے کپڑے پہنوں، کتنی خوشبوئیں چھڑکوں کہ میرا عیب چھپ جائے۔ کیا میں کبھی تیرے سامنے نہ آ سکوں گی، تجھ سے مل نہ پاؤں گی۔ کیا تو کبھی نہ ملے گا۔ کبھی نہیں.....''

اس کے دل کو کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

''کسے یاد کرتی ہے عیشو؟'' اماں جانے کب سے دروازے میں کھڑی تھیں۔ گربہ پائی سے چل کر اندر آئیں تو اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

''کس سے باتیں کرتی ہے؟'' ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے عائشہ کو چونکا دیا۔ شاید وہ اس کی بڑبڑاہٹ سن چکی تھیں۔

''اتنا تیز مشک کس شے کا ہے۔ سانس الٹ رہا ہے۔'' اماں نے ناک سکوڑ کر فضا میں رچی تیز باس کو سونگھا۔ ''یہ تو نے لگایا ہے؟ یہ تو تیرے ابے کا عطر نہیں ہے؟''

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ یہ عطر کی شیشی بڑی پیٹی میں پڑی رہتی تھی ابا جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تو عطر ضرور لگاتے تھے۔

''تو نے نہا لیا اس سے۔ ساری شیشی خالی کر دی ہے کیا۔ تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے کڑیے۔'' اچانک اماں خاموش ہو گئیں۔ انہیں شدید دھچکا لگا تھا۔ عائشہ نے ان نئے جوڑوں میں سے ایک پہن رکھا تھا جو انہوں نے اس کے جہیز میں رکھنے کے لیے سلوائے تھے۔

''تو نے داج کا سوٹ پہن لیا۔ کس واسطے؟ اتنی گرمی میں کیوں پہنا تو نے ریشمی جوڑا؟''

وہ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ بس خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

''داج کا جوڑا وِیاہ سے پہلے پہننا برا شگن (شگون) ہوتا ہے۔ کسے دکھانا تھا تو نے۔ بولتی بھی نہیں۔ کیوں اتنی خشبو چھڑک کر نواں جوڑا پہن کر دوہٹی بن بیٹھی ہے۔ یہ چالے (چلن) بی

بی دھیوں کے نہیں ہوتے، بھلے وقتوں میں خشبو والے صابن سے منہ نہیں دھوتی تھیں کنواری کڑیاں۔ برا سمجھا جاتا تھا۔ ہار شنگار (سنگھار) نہیں کرتی تھیں۔ بڑے شرموں والے زمانے تھے۔ چندریئے مجھے دکھ نہ دینا کوئی، مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

ان کے لہجے میں نرمی مگر آنکھوں میں وسوسے کلبلا رہے تھے۔ باہر سے کنیز بھاگی ہوئی آئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔

''اماں! بات کر کے آ گیا ابا۔ عجی آ رہا ہے اگلے اتوار کو۔'' وہ بہت پرجوش لگ رہی تھی۔

عائشہ کو یوں لگا جیسے اس کے سینے میں دل کے مقام پر خنجر گاڑ دیا گیا ہو۔ دروازے کے ادھ کھلے کواڑوں سے اندر آتی روشنی آگ کی لاٹ بن کر فرش کو چاٹتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھپھوندی لگی باسی روٹیوں کی بدبو عطر کی تیز مہک کو پچھاڑ کر سارے کمرے میں چکرانے لگی تھی۔

باہر صحن میں اماں رنگین پایوں والے پیڑھے پر بیٹھی بگو سے کہہ رہی تھیں۔

''کالج کی ہوا لگ گئی ہے، پہلے ورگی نہیں رہی۔ یہ تو جیسے کوئی اور ہے۔ کوئی دوسری، کوئی کالج کی کڑی۔ نماز میں بھی کوتاہی کرن لگی ہے۔ پہلے بانگ کی آواز کان میں پڑتے ہی وضو کرن بیٹھ جاتی تھی۔ اب بانگ ہوتی رہے۔ لک توڑ کے پڑی رہتی ہے۔ ہلتی ہی نہیں۔ رہا خیر، سو ہنیار باخیر، میرے مولا خیر.....''

✠ ✠ ✠

''شادی کی مودی تیار ہوگئی ہے۔ کل صبح مودی اور تصاویر ڈیڈی کو بھجوا دوں گا۔'' وہ گھر کے سامنے سڑک پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ جب اونیل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تھا۔

ایک کال کلچی اسٹریٹ لائٹ کے گرد جمع ہونے والے پروانوں پر جھپٹ رہی تھی۔ جب وہ لائٹ کے قریب جاتی تو اس کے سیاہ پروں کے باعث سڑک پر کالے دھبے بکھر جاتے اور اونیل کا چہرہ چھپ جاتا۔ جاشیہ کے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کال کلچی اپنے پروں کو لائٹ کے گرد لپیٹ دے اور وہ اونیل کا چہرہ نہ دیکھ پائے، وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ فریب دیتے ہوئے کسی شخص کا

چہرہ کتنا مکروہ نظر آتا ہے۔ اس نے زندگی میں بہت سے جھوٹ بولے تھے، اور ایک بار بھی اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ جھوٹ اس کے چہرے پر کس رنگ کی استرکاری کرتے تھے۔

''تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سنو۔ ڈلیوری کے موقع پر پتا ہے میں تمہیں کیا گفٹ دینے والا ہوں۔ یقیناً تمہیں نہیں معلوم تمہاری اپنی گاڑی کی چابی۔''

اس نے لہجے میں ڈرامائی تاثر پیدا کیا۔

''خاموش کیوں ہو؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ کوئی سیکنڈ ہینڈ گاڑی نہیں دے رہا تمہیں، بالکل نیو برانڈ چمچماتی کار ہوگی۔ کم آن یار تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی، تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ یہ مسائل ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ بس تھوڑے عرصے بعد ہم واپس اپنے گھر چلے جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے پروانوں پر جھپٹتی ہوئی کال کلچی کو دیکھتے ہوئے فقط اتنا کہا تھا۔

''میں اندر جانا چاہتی ہوں۔''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اونیل صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔

''کافی کا موڈ ہو رہا ہے۔''

''تم عیسائی ہو؟''

وہ ایک لمحے کے لیے چونکا جیسے اس کے جملے کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو پھر ایک طویل سانس بھری۔

''تو یہ بات ہے..... ہاں میں اب تک کرسچن ہوں، ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہوں گا۔''

''کیوں؟ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور بس۔''

''تم نے کہا تھا تم اپنا مذہب چھوڑ چکے ہو۔''

''میں کیوں چھوڑ دیتا؟ میں اپنے مذہب سے مطمئن ہوں۔ مجھے اس مذہب کے علاوہ دنیا کے کسی مذہب پر اعتماد نہیں تو میں کیوں چھوڑتا۔''

''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟''

''تمہارے لیے ان باتوں کی اہمیت ہی کیا ہے؟ تمہیں کسی مذہب سے کیا لینا دینا۔ تم تو کسی بھی مذہب سے تعلق نہیں رکھتیں۔ تم نہ تو مسلمان ہو نہ عیسائی ہو نہ یہودی۔ تم تو کسی بھی حوالے سے خدا پر یقین نہیں رکھتیں۔ تمہیں تو کبھی ان باتوں کی پروا نہیں رہی۔''

اسے لگا اونیل نے اسے گالی دی ہے۔ اس کے الفاظ تازیانے بن کر لگ رہے تھے۔

''اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم کسی مسلم کی بیوی رہو یا کرسچن کی۔ جب تمہاری نظر میں اس بات کی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''فرق پڑتا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ ایک مسلم عورت عیسائی مرد کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا تعلق جائز نہیں ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا تم اس چیز کو ایشو کیوں بنا رہی ہو۔ تم سے شروع کی چند ملاقاتوں میں، میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ تم مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہو اور پابندی سے دور بھاگتی ہو۔ میں نے تب اسی لیے مسلم ہونے والی بات مان لی تاکہ تم پریشان نہ ہو۔ میرا خیال تھا، وقت کے ساتھ ساتھ تم ایڈجسٹ کر جاؤ گی۔ دیکھو کرسچینٹی کے علاوہ کوئی مذہب سچا نہیں۔ تم بے شک عبادت نہ کرو، بے شک چرچ میں جا کر کرائسٹ کے سامنے نہ جھکو مگر کم از کم اسے درست حوالے سے پہچان تو لو۔ یہ میری خواہش ہے کہ تم کرسچینٹی اپنا لو۔ میں تمہیں فادر کے پاس لے جاؤں گا۔ تمہارے دل میں جو بھی شبہات ہیں، وہ دور ہو جائیں گے۔ تم یسوع مسیح کی پناہ میں آ جاؤ۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس میں کتنا سکون ہے۔ میں چاہتا ہوں خداوند کی نظر میں ہمارا تعلق جائز ہو جائے۔''

''میں مسلمان ہوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے.....''

''میں کرسچینٹی کی سچائی کے ثبوت میں ہزار دلائل دے سکتا ہوں۔''

اس نے گردن جھکا لی تھی۔ وہ اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک دلیل بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اسے اپنے مذہب کی سچائی پر یقین نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ وہ کسی ایک دلیل کو بھی درست طور پر پیش کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتی تھی۔

''پلیز تم میری خاطر کرسچن ہو جاؤ۔ تمہیں بپتسما دے کر مسیحی جماعت میں داخل کر لیا جائے گا۔ یہ بہت آسان ہے۔ میری خاطر تم.....''

''میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا۔ میں نے.....'' وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی قربانیاں اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں گنوایا جا سکتا۔

''میرا بچہ..... اس کا کیا ہوگا؟''

''بچہ باپ کے مذہب پر چلے گا۔ میں اسے ایک اچھا کرسچن بناؤں گا۔''

''میرا بچہ مسلم ہوگا۔'' وہ بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اس کا تم سے اور تمہارے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔''

''تم کرسچن ہو جاؤ۔ ہم بہت اچھی زندگی بسر کریں گے۔ ذرا سوچو میں تمہیں چھوڑ دوں تو تمہارا کیا ہوگا۔''

''میری ماں نے مجھے اللہ سے خوف کھانے کو کہا تھا۔ میں اس سے نہیں ڈری اور جب تم نے مجھے چھوڑنے کی دھمکی دی تو میں تم سے ڈر گئی۔ میں نے اللہ کو چھوڑا تھا۔ تم مجھے چھوڑ دو تو یہ حیرت کی بات نہیں۔''

''یکدم تم پر اسلام کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے، کیا رکھا ہے اس نام نہاد مذہب میں؟ جو چند اچھے اصول اسلام میں موجود ہیں، وہ توریت اور انجیل سے لیے گئے ہیں۔ اس کے سوا بس لچھے دار باتیں ہیں، پیچیدہ عقائد ہیں۔ ساری دنیا میں مسلمان رسوا ہیں۔ ان کی تاریخ بربریت اور خونریزی سے بھری ہوئی ہے۔ مجھے نفرت ہے.....''

وہ خاموش ہو گیا تھا۔

جاشیہ نے اتنے زور کا تھپڑ اس کے چہرے پر مارا تھا کہ اس کا منہ گھوم کر رہ گیا تھا۔ وہ خود حیران تھی۔ پتا نہیں اس کی باتوں نے کیسی آگ بھر دی تھی کہ وہ خود کو روک نہ سکی۔ اس کا سارا جسم غصے سے لرز رہا تھا۔ اونیل اپنے گال پر ہاتھ رکھے ہوئے اٹھا اور پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ اس وقت دروازے سے قریب کھڑی تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی کھلے دروازے سے اندر جا گری۔ دروازہ ایک زوردار دھماکے سے بند ہو گیا تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی۔ اسے اپنی ماں سے کی ہوئی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ سارے جھوٹ جو اس نے بولے تھے۔ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ آنکھیں کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے کوئی پناہ چاہیے تھی جس میں وہ خود کو

چھپالے۔ اسے کوئی آسرا درکار تھا لیکن وہ تنہا تھی۔

اسے لگ رہا تھا، وہ ریت کی قبر میں دھیرے دھیرے دفن ہو رہی ہے۔ اس کا سانس بند ہو رہا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے سر اٹھا کر اپنے آس پاس دیکھا۔ وہ اس کمرے میں تھی، جس میں دیواروں کے ساتھ زنگ آلود لوہے کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے اردگرد عجیب الخلقت پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ اس نے دیوار پر سوئچ بورڈ کو ٹٹول کر لائٹ جلائی اور دیوار کے ساتھ لگ کر دوبارہ نیچے بیٹھ گئی۔ لوہے کی الماریاں خاموش تھیں۔ دیواریں چپ تھیں۔ صرف اس کی ہچکیوں کی آواز وقفے وقفے سے سکوت کو تاراج کر جاتی تھی۔ وہ روشندان کو دیکھنے لگی۔ روشن دان بند تھا۔ شیشے پر سفید پینٹ کے دھبے تھے۔ یکبارگی قریب ترین الماری کے پایوں سے چھت کی سمت ایک آواز نے لہرا لیا۔

''تیں سمجھے توت کی گلی ڈال ہووے۔ لچکے جاوے لچکے جاوے۔ ٹوٹے ناں بھل اے تیں کی بھل اے۔ ناں ری تیں ککر کی سوکھی دمی سوٹی۔ جری جیادہ وجن پڑے تاں تڑک جاوے۔''

(تو سمجھی تھی کہ تو شہتوت کی گیلی شاخ ہے جو لچکتی ہے ٹوٹتی نہیں، یہ تیری بھول ہے تو تو کیکر کی سوکھی شاخ، جس پر ذرا وزن پڑا ٹوٹ جائے گی۔)

یہ جملے شاید بہت عرصہ پہلے کسی عورت نے اس سے کہے تھے۔ اسے یاد نہیں تھا، وہ عورت کون تھی۔ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود اسے یاد نہ آ سکا کہ وہ کہاں ملی تھی۔ اس کا چہرہ ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی کہی ہوئی باتوں کا مفہوم اسے بخوبی سمجھ آ رہا تھا۔

وہ شہتوت کی گیلی ڈالی نہیں تھی۔ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ نہیں لچک سکتی تھی۔ وہ تو کیکر کی خشک شاخ تھی۔ اس کی اوقات سے بڑھ کر بوجھ پڑا تھا اور وہ ٹوٹ گئی تھی۔

''ری کوئی سونق سے نہ گرے۔ پیر پھسل جاوے۔ تیں گری تاں کون نکالے گا تیں کوں وس نے ہتھ نہ پکڑا تاں بول ری کیسے نکلے گی۔ کون نکل سکے اے وس کے ہتھاں بگیر۔'' (کوئی شوق سے نہیں گرتا، پیر پھسل جاتا ہے۔ تو گری تو کون نکالے گا۔ اس نے ہاتھ نہ پکڑا تو بتا کیسے نکلے گی کون نکل سکتا ہے، اس کا ہاتھ پکڑے بنا)

آواز الماریوں کے بیچ، دیواروں کے درمیان کسی ایسی چڑیا کی طرح بھٹک رہی تھی جسے باہر جانے کی راہ سجھائی نہ دیتی ہو۔

وہ بالکل بھول گئی تھی، یہ جملے کس نے کہے تھے۔ شاید کہنے والی نے کچھ اور بھی کہا تھا، لیکن کیا؟ اسے یاد نہیں تھا۔ اس نے بہت سوچا مگر بے سود۔ اس بھولی بسری عورت کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ اٹھی اور ایک الماری کے پٹ کھول کر کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔

الماری کے خانوں میں کتابیں، فائلیں اور خطوط کے پلندے ٹھنسے ہوئے تھے۔ کئی کاغذات اس قدر بوسیدہ تھے کہ ہاتھ لگانے سے راکھ کی طرح جھڑنے لگتے تھے۔ اس نے ساری الماری کھنگال ماری۔ ایک ایک کتاب، کاغذ کے ایک ایک پرزے کو دیکھ لیا، اسے وہ نہیں مل سکا جو وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ بے بسی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ فرش پر گھٹنوں کے بل گر گئی تھی۔

کمرے میں پانچ الماریاں تھیں اور سب کی سب کاغذوں، کتابوں سے اٹی پڑی تھیں۔ وہ کنپٹیاں مسلتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب اسے کس الماری کی تلاشی لینا چاہیے۔

یہ دوسری الماری یا شاید وہ والی الماری جو انتہائی کونے میں رکھی ہوئی تھی یا شاید وہ جو دیوار کے ساتھ روشندان کے نیچے تھی۔ ہر الماری کو دیکھ کر اسے شبہ ہونے لگتا کہ اس کی مطلوبہ شے اسی الماری میں تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی سسکیاں پورے کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

اس عورت کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ ایک روز ان پانچ الماریوں میں سے کسی ایک کو بلا مقصد کھنگالتے ہوئے اسے قرآن پاک کا نسخہ نظر آیا تھا اور بغیر کھولے اس نے واپس اسی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ اب اسے اسی کی تلاش تھی۔ اسے وہ کتاب چاہیے تھی۔ اسے کسی ایک آیت کسی ایک حرف کی ضرورت تھی جو اللہ سے متعلق تھا۔

وہ اٹھی اور دوسری الماری کی طرف بڑھی۔ وہ کرم خوردہ کتابوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ پہلے خانے سے آخری خانے تک اس نے ساری کتابیں دیکھ ڈالیں۔ اسے قرآن پاک نہیں ملا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے تیسری الماری کی تلاشی لینے لگی۔ وہ کتابوں کو دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر فرش پر اچھال دیتی۔ اس نے ساری الماری خالی کر ڈالی۔ اس کی پشت پر کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ گرد سے اٹ گئے تھے۔ اس کے بالوں

میں کاغذ کے بے شمار پرزے اٹکے ہوئے تھے۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی نکڑ میں رکھی الماری کے قریب چلی گئی اور وہی عمل دہرانے لگی۔ وہ کتابوں کو باہر پھینکتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس الماری سے بھی وہ کچھ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ وہ اپنے بال نوچنے لگی اور کتابوں کے ڈھیر پر گر کر اونچی آواز سے رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی گرد جمع ہو گئی تھی کہ اسے دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔

اب صرف ایک الماری بچی تھی۔

''اگر اس میں بھی اللہ کی کتاب نہ ہوئی تو.....''

اسے لگا، وہ مر جائے گی۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ وہ اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں کو سختی سے رگڑتے ہوئے اٹھی اور لرزتے ہاتھوں سے پانچویں الماری کے پٹ کھولے۔ اب وہ کتابوں کو نہایت آہستگی اور سست روی سے دیکھ رہی تھی۔ تیسرے خانے کی پہلی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ وہ قرآن پاک تھا۔ اس نے اندھی آنکھوں کو پھاڑ کر کتاب کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ واقعی قرآن تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

گرد جمے اوراق کو بے تحاشہ چومتے ہوئے وہ عین بلب کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ اسے عربی پڑھنا نہیں آتی تھی۔ بچپن میں محض ایک دفعہ قرآن پاک پڑھا تھا مگر اس کے بعد کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ فراموش کر چکی تھی۔ اس نے جلتی آنکھوں سے حروف کو شناخت کرنے کی کوشش کی اور ہجے کر کے اٹک اٹک کر پڑھنے لگی۔ اس کی ہچکی بندھ گئی تھی اور تھوڑی سی دیر بعد جسم کو جھٹکا سا لگتا تھا۔ وہ پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ الفاظ ادا کرنے میں اسے سخت دقت پیش آ رہی تھی۔ بے بسی کے مارے وہ پھر سے رونے لگی۔

سطروں کے نیچے نہایت باریک لکھائی میں ترجمہ لکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مٹی کے ذرات کی ایسی چبھن تھی کہ وہ اردو میں لکھے ترجمے کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے گیلی گدلی آنکھوں کو زور سے رگڑ ڈالا اور جھک کر باریک حروف کو اونچی آواز میں پڑھنے لگی۔

''جب آسمان پھٹ پڑے اور تارے جھڑ پڑیں اور جب سمندر بہا دیے جائیں اور جب قبریں کریدی جائیں تو ہر جان جان لے گی جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے۔ اے آدمی، تجھے

کس چیز نے فریب دیا، اپنے کرم والے رب سے.....''

آنسوؤں کے گولے نے اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ آنکھوں میں تنی ٹیالی دھند کی چادر نے اس کی بینائی چھین لی تھی۔

''تجھے کس چیز نے فریب دیا، اپنے کرم والے رب سے جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا۔''

اسے کند چھری سے ذبح کیا جا رہا تھا۔ درد کی شدت اس کی برداشت سے باہر تھی۔

''جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا، پھر ہموار فرمایا جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔''

وہ قرآن کو سینے سے بھینچ کر چلانے لگی۔ اس کا پورا وجود ایک ٹیس بن گیا تھا، ہر مسام سے آنسو ابل رہے تھے۔ ساری رات وہ روتی رہی تھی۔ قرآن کو سینے سے لگائے کمرے کے طول و عرض میں بھٹکتی رہی تھی۔

نہ جانے کس وقت اس پر غنودگی طاری ہوئی۔ کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک الماری کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ قرآن اب بھی اس کے بازوؤں میں موجود تھا۔

دروازے کا ہینڈل گھومتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھی، قرآن کو الماری میں چھپا دیا اور پھر سے نیچے بیٹھ گئی۔ اونیل آہستگی سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے اس کے قریب زمین پر رکھ کر وہ خود بھی پاس بیٹھ گیا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ میں ساری رات سو نہیں سکا۔ مجھے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم بھول جاؤ ساری بات کو۔ میں تمہیں مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ ہم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی تو زندگی گزار سکتے ہیں۔ تم ٹینشن مت لو۔ مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں اپنے الفاظ پر شرمندہ ہوں۔ تم کھانا کھا لو پلیز۔ رات سے بھوکی ہو۔ ان دنوں تمہیں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ میں بھی پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں دکھ نہ دوں۔ بچے کی زندگی اور صحت کے لیے تمہارا خوش رہنا ضروری ہے۔ اب ہم اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کریں گے۔ پلیز کھانا کھا لو۔''

وہ منت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔

جائیہ کا جھکا ہوا سر نہیں اٹھا۔ اس نے ایک نظر بھی اونیل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''میں سوری کہہ رہا ہوں۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا۔ تم بھی اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کرو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ آئی سویئر مجھے تم سے محبت ہے۔''

اونیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لمس کسی جل تھلیے کا لمس تھا، نم رستا ہوا، کراہت انگیز۔ اس نے جھرجھری لے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اونیل کا چہرہ نظروں میں آتے ہی اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ غلیظ پھوڑوں سے بھرا ہوا مکروہ چہرہ، پیپ سے لتھڑے زخم، وہ گھسٹ کر پرے ہوگئی۔ ایسا ہی چہرہ وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ مجذوم بھکارن اسے یاد آ گئی تھی اور یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ اسے کوڑھی کہہ رہی تھی۔

''کوڑھی اے کوڑھی..... ایں کوڑھی اے.....'' ایک وحشت بھرا قہقہہ زہریلے بھڑ کی مانند اس کے کان میں بھنبھنایا۔

بے اختیار اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں کی جانب گئی تھی۔ وہی ادھڑی ہوئی جلد والے چرے، پھٹے ہاتھ، گلابی گڑھوں سے پر کلائیاں، لیس دار مواد سے بھرے ہوئے آبلے، وہ اپنے ہاتھوں پر آنکھیں گاڑے پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔

''تیں کوڑھی اے۔ تیرو من کے بھیتر ماں کوڑھ اے۔'' ہوا میں زہریلی سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔

''واجو سوہنی چڑی ماں لکائے پھریں کوڑھ، ان سے تیں گھن کیوں نہ کھاوے۔'' (وہ جو سوہنی چڑی میں کوڑھ چھپائے پھرتے ہیں تو ان سے گھن کیوں نہیں کھاتی) اس سے کچھ فاصلے پر ایک کوڑھی اپنے غلیظ ہاتھ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

''وس کوں سب دکھے۔ واسب کے بھید جانے۔ بھیتر کی باتاں جانے۔ واتیں سے گھن کھا گیا۔ تاں بول ری کیا کرے گی تیں۔ کدھر جاوے گی۔ بول ری تیں کیا کرے گی۔ بول ری..... بول ری.....'' (وہ سب دیکھتا ہے، وہ سب کے بھید جانتا ہے، اندر کی باتیں جانتا ہے وہ تجھ سے گھن کھا گیا تو بتا کیا کرے گی) اس ایک آواز کے سوا اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

✠ ✠ ✠

''میری کس غلطی نے تجھے ناراض کر دیا۔ میں کیا کروں، تجھے کیسے منا لوں؟ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تیری ناراضی سہہ سکوں۔ مان جا۔ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ تیرے بغیر میں گھل گھل کر ختم ہو رہی ہوں۔ اگر تیری یہی رضا ہے تو مجھے ایک ہی بار موت دے دے۔ میں گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ راکھ بن رہی ہوں۔ تو ایک ہی بار مجھے جلا ڈال جیسے تنور میں گرنے والا تنکا ایک لمحے سے پہلے فنا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ آئے۔ اگر وہ آ گیا تو میں..... میرے جسم سے پھوٹتی بدبو سب جان لیں گے۔ لوگ مجھ سے گھن کھائیں گے۔ تو روک لے اسے۔ اسے نہ آنے دے۔ تو روک سکتا ہے۔ صرف تو..... اور اگر اسے آنا ہے تو صبح ہونے سے پہلے مجھے موت دے دے۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔''

وہ ساری رات گڑگڑاتی رہی تھی۔

صبح ہوئی لیکن وہ زندہ رہی۔ ہر آہٹ پر اس کی نظر دروازے کی اور رینگنے لگتی۔

اماں گڑ والی روٹیاں پکاتے ہوئے کوئی لوک گیت گنگنا رہی تھیں۔ کنیز صحن میں بکھرے املی کے پتے اور بگو کی مینگنیاں سمیٹتے ہوئے جھاڑو کو چنور کی مانند لہرا رہی تھی اور آپ ہی آپ ہونٹوں میں مسکائے جاتی تھی۔ ابا، جان بوجھ کر صبح سویرے گھر سے نکل گئے تھے تاکہ اماں عجی سے تنہائی میں بات کر سکیں۔

دھوپ ابھی آنگن میں نہیں پھیلی تھی۔ اماں مرغیوں کو ڈربے سے نکالتے ہوئے بیرونی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ کنیز دروازے کے پاس بلا مقصد جھاڑو لگا رہی تھی۔ جب جھاڑو کے تنکے بھوری پشاوری چپل تلے آ گئے۔ عائشہ نے عجی کو دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ سنبل کے درخت پر چیل کا گھونسلہ تھا۔ چیل تراہ تراہ کرتی درخت کے گرد چکرا رہی تھی گلی میں۔ ٹیٹریاں آسمان کی سمت گردنیں اٹھائے بارش کی آس میں بین کرتی تھیں۔

عجی کے قدموں کی دھمک یوں گونجتی تھی جیسے ڈھول پر تھچی سے ضرب لگائی جا رہی ہو۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ کنیز کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اماں کے ساتھ اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کنیز دروازے سے کان چپکا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ عائشہ نے راکھ راکھ بدن کو گھسیٹنے کی کوشش کی اور کئی قرنوں کی مسافت طے کر کے پرانے سامان والی کوٹھڑی میں پہنچی۔ کچی دیوار کا سہارا لے کر وہ زیر لبی میں بولنے لگی۔

''تو نے مجھے چھوڑ دیا ہے، میری آواز تجھ تک کیوں نہیں پہنچتی؟ تو میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے.....''

وقت کسی گاڑھے مائع کی طرح رینگ رہا تھا۔ عجی کے بولنے کی مدھم آواز اس کے کانوں میں یوں اتر رہی تھی، جیسے وہ کسی کنویں کی تہ میں بیٹھا بول رہا ہو۔ پھر اس نے اماں کو چیختے سنا تھا۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ اس کا نچلا دھڑ زور سے کانپا اور وہ راکھ کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ قدموں کی چاپ اس کی سمت بڑھ رہی تھی۔ کنیز نے دروازے سے اندر جھانکا۔ وہ رو رہی تھی۔ ایک جلتی نگاہ اس پر ڈال کر کچھ کہے بغیر لوٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے پھوٹتی نفرت کی چنگاریاں ہوا میں معلق رہ گئیں۔

''میں کسی اور کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی۔ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے بچا لے۔ میرا ہاتھ نہ جھٹک..... میں نے جان بوجھ کر کوئی گناہ نہیں کیا۔ تو بے شک میری بے گناہی ثابت نہ کر۔ پر مجھے چھپا لے، لوگوں کی نظروں سے چھپا لے۔ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اللہ مجھے موت دے دے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور مجھے دیکھے میری.....''

اسے لگا کہ دروازے کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ وہ عجی کی محض ایک جھلک دیکھ پائی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر گیا تھا۔ کواڑ کی درز سے اس نے اماں کو تنور کی سمت جاتے دیکھا۔ وہ جھک کر ایک لکڑی اٹھا رہی تھیں۔ اب ان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا۔ اس نے آنکھوں پر سختی سے ہاتھ جما کر چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

✠ ✠ ✠

''جوٹھے باسنوں میں رزالے کھاتے ہیں چاچی۔ میں بے غیرت نہیں ہوں جو آنکھیں میٹ کے (بند کر کے) یہ برداشت کر لوں۔''

اماں نے پیٹی کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچا رکھا تھا۔ تھوک نگلتے ہوئے چیخ کر بولیں۔

''روک لے اپنی زبان کو۔ اک حرف بھی اور کہا تو تیرا لہو پی جاؤں گی۔ میری دھی پر تہمت لگاتے تیرا دل نہیں کانپا۔ خدا کا خوف کر کچھ۔''

''او مجھ پرایویں گرم نہ ہو چاچی۔ میں نے اسے ملنے سے روکا۔ بہت کوشش کی کہ اس بے حیائی سے رک جائے۔ پر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اس نے اپنا رنگ دکھا کر چھوڑا۔ میرا احسان مان، میں نے بھرم رکھا تم لوگوں کا۔ گھر میں بات نہیں کی کسی سے۔ چپ چپیتے اسے ادھر چھوڑ گیا۔ جو میں چپ نہ رہتا تو کیا ہوتا جانتی ہے تو۔ اسی وجہ سے میں نے اپنا تبادلہ کروالیا۔ اس کتے کو بہت ڈھونڈا میں نے، بڑا تلاش کیا۔ اس کا خون کر کے پھانسی چڑھنا قبول ہے مجھے پر یہ بے غیرتی کی زندگی قبول نہیں۔ وہ بھاگ گیا ہے کہیں۔ میں بھی چھوڑوں گا نہیں اسے۔ جہاں بھی ملا کتے کی موت ماروں گا۔ اور رب کا واسطہ ہے۔ اب اس بات کو پی جانا۔ اپنے دل میں دفن کر لینا۔ کہیں تھانہ کچہری نہ کرنے لگ پڑنا۔ لوگ تھوتھو کریں گے۔''

وہ چلا گیا تھا۔ کمرہ یوں ڈول رہا تھا جیسے بہتے پانی پر تیر رہا ہو۔ اماں نے باہر آ کر تنور کا رخ کیا تھا، شیشم کی ٹیڑھی سی شاخ ہاتھ میں لے کر وہ عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ زمین پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اس نے عنابی رنگ کا نیا جوڑا پہن رکھا تھا، اور کپڑوں پر اتنا عطر لگایا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اماں چند قدم اٹھا کر اس کے سر پر پہنچیں اور

منہ سے کچھ کہے بنا لکڑی سے اسے مارنے لگیں۔ ہر ضرب پر اس کا جسم کانپتا اور وہ پرے کھسکتی جاتی۔

اماں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ چوٹ کہاں کہاں لگ رہی تھی۔ اس کا سر، بازو، گردن، کندھے سب لکڑی کی زد میں آ رہے تھے۔ اس نے نہ تو ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد ہوئی۔ کنیز روتی ہوئی اندر آئی اور اماں کو بازو رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ انہوں نے اسے دھکا دے کر پرے کر دیا تھا۔ عائشہ کھسکتے کھسکتے جستی ٹرنکوں کے ساتھ جا لگی تھی۔ اماں نے آگے بڑھ کر لکڑی اس کے کندھے پر ماری تو وہ اوندھے منہ گر گئی۔ ان پر وحشت سوار ہو چکی تھی۔ وہ اس کی پیٹھ پر ضربیں لگانے لگیں، لکڑی اس کی قمیص میں الجھ گئی۔ اور سوتی کپڑا کندھوں پر سے چرر کی آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔

ضرب لگانے کے لیے اٹھا ہوا اماں کا ہاتھ اس طرح گرا تھا جیسے انہیں فالج ہو گیا ہو۔ عائشہ کی شفاف جلد پر ان کی لگائی ہوئی چوٹوں سے ابھرنے والی سرخی کے ساتھ جلنے کے سیاہی مائل بھورے نشان بھی دمک رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے دو آنسو پھسل کر اس کی کمر پر گرے وہ درخت کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر ڈھے گئی تھیں۔

''ایک دو.....تین'' وہ سرخ لکیروں کے درمیان رینگتے ہوئے بھورے دھبوں کو گننے لگیں۔ ''چار.....'' ان کے جھریوں بھرے ہاتھ یوں زخموں کو ٹٹولتے تھے جیسے وہ اندھی ہوں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ ان کے ضعیف چہرے پر پھسلتے آنسو عائشہ کی کمر پر گر رہے تھے۔ کنیز بھی اماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اماں نے عائشہ کو سیدھا کر کے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ہنسلی کی ہڈی سے کسی جونک کی طرح چمٹا ہوا نیل کا نشان ان کی دھندلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر وہ دیر تک بین کرتی رہی تھیں۔

اس روز اماں نے دوپہر کی روٹیاں لگانے کے لیے تنور نہیں جلایا۔ بگو کو چارہ نہیں دیا، نہ ہی اس سے کوئی بات کی۔ مرغیوں کو دانہ نہیں ڈالا۔ املی کی شاخوں میں لٹکتے ہوئے آب خوروں میں چڑیوں کے لیے چوگا نہیں ڈالا۔ کنیز نے ہانڈی نہیں پکائی۔ سیوتی کے پھولوں کو پانی نہیں دیا، ابا گوشت کا لفافہ اٹھائے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو مرغیاں بھاگ کر باہر گلی میں نکل گئیں۔ آنگن میں کھاٹ پر لیٹی اماں آسمان کو تک رہی تھیں۔ کنیز نلکے کے گرد چنی ہوئی پختہ اینٹوں کی

مینڈھ پر بیٹھی تنکوں سے کھیل رہی تھی۔ املی کے تنے سے بندھی ہوئی بگو بھوک سے بلبلا رہی تھی۔

''عجی چلا گیا؟''

''ہاں.....'' اماں کے پپڑی جمے ہونٹ ذرا سا ہلے۔

ابا کی آنکھوں میں تجسس ابھرا اور وہ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئے۔ ''میں تو گوشت لایا تھا۔ پٹھ کی بوٹیاں ہیں۔ عجی کو پسند ہے ناں۔ بات ہوئی؟''

''انکار کر دیا اس نے۔''

''انکار کر دیا؟'' لفافے پر ابا کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ''کیوں.....کس لیے انکار کر دیا؟''

''بس کر دیا۔ مرضی اس کی۔''

''پوری بات سنا مجھے۔ اٹھ کر بیٹھ، کیا بات ہوئی تھی؟''

اماں اٹھ کر نہ بیٹھیں۔ ''عیشو اب وہاں نہیں جائے گی، پڑھائی کو ادھر ہی ختم سمجھو۔''

''مجھے بھی پتا ہے۔ اب یہ کیسے جا سکتی ہے۔ حیرانی والی بات ہے عجی اتنا بے دید ہو گیا، میں تو سمجھتا تھا، لحاظ والا منڈا ہے۔ اسی لیے تیری بات مان گیا تھا، اب خوش ہے۔ پڑ گئی سینے ٹھنڈ، گھر بلا کے بے عزتی کروالی۔ سر میں خاک ڈال گیا وہ۔''

اماں نے کوئی جواب نہ دیا، اور کروٹ لے کر پہلو کے بل لیٹ گئیں۔

✠ ✠ ✠

شام اپنی آبنوسی انگلیوں سے کھڑکیوں اور روشندانوں کے شیشوں پر دستک دے رہی تھی۔ اور اس دستک کا جواب دینے کے لیے کمرے کے گوشوں سے مبہم پرچھائیاں سر ابھار رہی تھیں۔

وہ سجدے میں گری رو رہی تھی۔

''تو نے مجھے کیوں بنایا؟ بنایا تھا تو میرا دل کیچڑ سے کیوں بھر دیا۔ جن آنکھوں سے میں اس کا چہرہ دیکھتی تھی وہ تو نے چھین کیوں نہ لیں۔ جن قدموں سے چل کر اس کی طرف جاتی تھی، وہ تو نے لے کیوں نہ لیے۔ جن ہاتھوں سے اسے چھوتی تھی، وہ تو نے مفلوج کیوں نہ کر دیے۔ جس

زبان سے اسے مخاطب کرتی تھی، وہ تو نے چھین کیوں نہ لی۔ تو نے کیوں نہ روکا مجھے؟''

وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر چیخنے لگی۔

''میں برباد ہوگئی۔ میں کوڑھی ہوگئی۔''

وہ اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگی۔

''میں کوڑھی ہوگئی۔ برباد ہوگئی میں۔ تو نے کیوں بنایا مجھے؟ کیا تجھے مجھ سے گھن آتی ہے؟ کیا تو مجھے اس گندگی سے نہیں نکالے گا، میرا ہاتھ نہیں پکڑے گا؟ کیا تجھے میرے گلے سڑے زخموں سے گھن آتی ہے؟ تو نہ نکالے گا مجھے۔''

وہ اپنے چہرے پر تھپڑ مارتی رہی۔

''میرے پاس کچھ نہ رہا۔ میں برباد ہوگئی۔ آگ لگی ہے، کیا دوزخ کی آگ ایسی ہو گی؟ کیا وہ بھی یونہی جلاتی ہے؟ میرے اندر الاؤ جلتے ہیں۔ تو مجھے نہ بچائے گا، مجھے سکون نہیں دے گا۔''

دروازے سے اندر آتا اونیل ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ پچھلے کئی روز سے وہ اسے اسی حال میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی، پھر اچانک پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی، خود کو مارنے لگتی۔ اسے دیکھ کر ڈر جاتی، بدک کر پرے ہو جاتی۔ کبھی بالکل چپ ہو کر ناخن چبانے لگتی۔ رات کو بتی جلا کر خود کو آئینے میں دیکھتی اور دہشت زدہ ہو کر چیخنے لگتی۔

اس نے عالیہ کو مستقل گھر میں رہنے کا پابند کر دیا تھا۔ ایک چوکیدار بھی رکھ لیا تھا۔ چوکیدار کا کام بنیادی طور پر جاثیہ پر نظر رکھنا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

جب اس کی بیماری بڑھتی چلی گئی اور سنبھلنے کی کوئی امید نہ بندھی تو وہ اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے لگا۔ سائیکاٹرسٹ کے علاج کے باوجود اس کی ذہنی ابتری دور نہیں ہوئی تھی۔ ہر سیشن کے بعد ڈاکٹر اس سے کہتا کہ ''آپ کی مسز تعاون پر آمادہ نہیں۔''

اس نے معالج تبدیل کر کے دیکھ لیا۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

وہ دھیرے دھیرے پاگل پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

''ڈاکٹر فرخ کہہ رہے تھے، تم ان کے ساتھ کوآپریٹ نہیں کر رہی ہو۔'' عالیہ کافی کا مگ اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ جب اونیل نے اسے مخاطب کیا تھا۔

اس نے مگ کے گرم کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے بل کھاتے دھوئیں پر نظریں جما دیں۔

''تم پلیز خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔'' اونیل ٹرے میں رکھا مگ اٹھا کر اس کے سامنے آن بیٹھا۔ ''تم کیوں اتنی خوف زدہ ہو؟ میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔'' گرد سے اٹے بے ترتیب بال، کیکر کے پھول جیسی رنگت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، ملگجے کپڑے۔ وہ پہچانی نہ جاتی تھی۔

''تم مجھے جانے کیوں نہیں دیتے؟ چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے؟''

''کہاں جاؤ گی تم؟ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں، تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ تم یہ وہم اپنے دل سے نکال دو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''میں دارالامان چلی جاؤں گی۔ تم مجھے جانے دو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''آج رات تمہیں ایک میوزیکل فنکشن میں لے جاؤں گا۔ ملک کے مشہور ترین پاپ سنگرز آ رہے ہیں۔ وہاں جا کر تم بہتر محسوس کرو گی۔'' وہ چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

''میں اب کبھی بہتر محسوس نہیں کر سکتی۔ مجھے کہیں جا کر سکون نہیں مل سکتا۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر فرخ خاصے پرامید ہیں۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت نہیں، مجھے صرف اللہ کی ضرورت ہے۔ بولو اللہ دے سکتے ہو مجھے، تم نے مجھے اللہ سے دور کر دیا ہے۔ مجھ سے اللہ کو چھین لیا ہے۔ مجھے کوڑھی کر دیا ہے۔''

کافی کے مگ کو ہاتھ کی ضرب لگا کر اس نے فرش پر پٹخ دیا تھا۔

''تم نے مجھے.....'' اس پر نظر پڑتے ہی وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ''تمہاری گھناؤنی شکل سے مجھے خوف آتا ہے، تم نے مجھے بھی اپنے جیسا بنا دیا۔ میں بھی کوڑھی ہوگئی۔ یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔''

عالیہ اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھی، لیکن وہ بالکل بے قابو ہوگئی تھی۔ اونیل اپنی

جگہ سے اٹھا اور اسے پکڑنے کے لیے بازو پھیلائے۔

''مجھے ہاتھ مت لگانا۔ دور رہو۔ اپنے ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔'' وہ خود کو عالیہ کی گرفت سے چھڑا کر الٹے قدموں بھاگ پڑی۔ اس کا پاؤں کارپٹ میں الجھا اور وہ منہ کے بل میز کے اوپر گر گئی۔ میز کا کنارہ اس کے پیٹ میں دھنس گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے چیخ رہی تھی۔

ادنیل نے چوکیدار اور عالیہ کی مدد سے اسے گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ اسپتال پہنچنے سے قبل ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

سفید چادر والے بیڈ پر آنکھ کھول کر اسے خود پر جھکا ہوا ادنیل دکھائی دیا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اگلے چند لمحوں میں اسے پتا چل گیا تھا کہ گرنے کے باعث وہ ماں بننے سے محروم ہو چکی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اپنی گود خالی ہونے پر دکھ نہیں ہوا۔ ادنیل بہت غمگین اور نڈھال تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھا مسلسل اسے تسلی دیتا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب وہ اسپتال سے گھر لوٹی تو کینا کے پھول مرجھا چکے تھے۔ موگرے کی جھاڑیاں جھونجھ ہو گئی تھیں۔ انار کے گلابی پھولوں کو بدلتے موسم نے چاٹ لیا تھا۔ املتاس کے شگوفوں کا زرد رنگ دھوپ نے اڑا دیا تھا اور سکھ چین کے پتوں پر برص کے داغ تھے۔

✠ ✠ ✠

اسوج کا چاند پچھمی دیوار کی منڈیر پر ٹکا تھا۔ مشکی گھوڑی جیسی رات دلکی چال چلتی اپنے سموں سے دھرتی کو روندتی جا رہی تھی۔ ستارے آسمان کے سینے کے چھید تھے، جن سے جلتی روشنی کی پھواریں برس رہی تھیں۔ املی ایک برہمن تھی جو بال بکھرائے سرد آہیں بھر رہی تھی۔ نہر پار والے بیلے میں گیدڑ روتے تھے۔

وہ آنگن میں چوکی پر بیٹھی اپنے ہاتھوں پر صابن مل رہی تھی۔ اماں بگو کی رسی کھول کر اسے پرانی کوٹھڑی میں لے جانے لگیں اور اس کے قریب رک گئیں۔

''چندریے! اس سے کیا ہوگا۔ یہ وہ میل نہیں جو صابن اتار سکے۔'' اماں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے ہاتھ سے صابن کی ٹکیا لے لی۔

وہ اپنے ہاتھوں پر لگے ہوئے جھاگ کو جلد پر رگڑتی رہی تھی۔

''اسے تو آب زم زم بھی نہیں دھو سکتا..... توبہ میں کیا کفر بک گئی ہوں۔'' اماں نے آسمان کی سمت دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''کملی نہ بن، اندر چل کے سوجا، نصیبوں سے کون لڑ سکتا ہے۔ جیسی لکھ دی لکھنے والے نے۔ مرضی سوہنے رب کی۔ ہیر پھیر نہیں ہو سکتا اس کے لکھے میں۔'' ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''ایک بات سن۔'' اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کے وہ بولیں۔ ''انکار نہ کرنا، نہ ہی یہ سمجھنا کہ میں تیری دشمن ہوں۔ وہ ہے ناں رفیق، جس کی بیوی زچگی میں فوت ہو گئی تھی، اپنی برادری کا ہے۔ دیکھا ہوگا تو نے۔ کئی بار تیرے ابے سے ملنے آیا ہے۔ منہ پر اس کے ماتا (چیچک) کے داغ ہیں پر دل کا چنگا ہے۔ وہ جو پرسوں بھاری جثے والی عورت آئی تھی، نسرین تھی وہ..... رفیق کی بہن..... صاف بات تو اس نے نہیں کی، پر مطلب یہی تھا کہ..... گول مول لفظوں میں تیرا رشتہ مانگ رہی تھی۔''

عائشہ کے چہرے پر حیرت بکھری نہ ہی آنکھوں میں طیش کے آثار پیدا ہوئے۔ اس کے چہرے کے سارے خطوط یوں ساکت تھے جیسے کسی پتھر پر کھدی ہوئی لکیریں، وہ چپ چاپ منہ اور گردن پر جھاگ ملنے لگی تھی۔

''تیری مرضی ہو تو بات چلاؤں۔'' اماں نے اس کا گھٹنا ہلایا۔ ''تیرے جوڑ کا نہیں ہے وہ، پتا ہے مجھے۔ کریم بخش بھی سن کر غصے ہوگا..... میں یہ نہیں کہتی کہ تجھ میں کوئی عیب ہے، اس لیے تیرا ویاہ دوہاجو سے کر دوں، برادری میں تیرے جوڑ کا کوئی ہے بھی تو نہیں۔ وڈا زمیندار ہے وہ، کھان پین کی کوئی تھوڑ نہیں ہوگی، لیڑا کپڑا استھرا ہوگا۔ عزت ہوگی۔ اور کیا چاہیے، یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں کوئی موقع دیکھ کر تیرے ابے سے بات کرتی ہوں۔ وہ تجھ سے پوچھے تو انکار نہ کر دینا۔ سوچ لے اڑیئے۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر رہی تیرے ساتھ۔''

اماں اٹھ کر جانے لگیں تو وہ چلمچی پر چہرہ جھکائے پانی کے چھپاکوں سے جھاگ اتار رہی تھی۔ ''بڑی رات ہو گئی ہے اندر آ جا۔ کریم بخش جاگ گیا تو غصہ کرے گا۔ چل میری دھی۔''

''میں آ جاتی ہوں اماں! تم چلو۔'' اس نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

اماں کے جانے کے بعد اس نے صابن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر جھک کر رک گئی۔

''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں کیوں خود کو دھوتی ہوں؟ اس سے کیا فرق پڑے گا؟ دھتورے کو سو سال چینی کے شیرے میں پکالو، وہ میٹھا نہیں ہوگا۔ اگال دان میں کسی نے آیتوں والے ورق بھی سنبھالے ہیں کبھی؟ کوڑے کے ڈھیر پر پھولوں کا کٹ چڑھانے سے وہ خوشبو تو نہیں دینے لگتا۔''

وہ خود کلامی کرتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔ کنڈی گرا کر وہ باہر آ گئی تھی۔

ان کے گھر کی دیوار کے ساتھ ایک بدرو بہتی تھی جسے گل عباس کے جھاڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بدرو پر چہرہ جھکا کر گندے پانی کو گھورنے لگی۔ ناکافی روشنی میں وہ غلیظ سیال مکمل سیاہ نظر آتا تھا۔ تعفن کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ اس نے گردن کچھ اور نیچی کر دی اور پانی کو گھورتے ہوئے بڑبڑائی۔

''اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟ اسے کون دھوئے؟ اس کی بدبو کون دور کرے؟''

بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا پھر بھی اس نے چہرہ نہیں ہٹایا تھا۔

''مجھے اسی قابل سمجھا نا؟ اسی قابل جانا تو نے۔''

وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی۔

''اسی قابل سمجھا تو نے.....اسی قابل.....''

✠ ✠ ✠

وہ قرآن پاک کو گود میں رکھے اٹک اٹک کر آیات پڑھ رہی تھی۔ اونیل کے منع کرنے کے باوجود وہ الماریوں والے کمرے میں سونے لگی تھی۔ رات کا بیشتر وقت وہ قرآن پڑھتی رہتی تھی۔ اونیل کی ہدایت پر عالیہ اس کے ساتھ والے کمرے میں سوتی تھی۔ آج صبح اونیل نے بتایا تھا کہ وہ چند دنوں میں کینٹ واپس جانے والے تھے۔

دور کہیں کھیتوں میں گیدڑ چلا رہے تھے۔ پڑھتے ہوئے اس کا دھیان بار بار ان بھید بھری آوازوں کی سمت چلا جاتا۔

''ہوں.....ہوں.....ہو.....ہو.....ہو.....کوڑا.....کوڑا.....ہو.....و.....و.....''ایک جغادری گیدڑ نحیف آواز میں چیختا۔

''نا.....نا.....اوں.....ہوں.....نا.....نا.....کوڑھی.....کوڑھی.....کوڑھی.....او.....ہو.....ہو.....''

کوئی نوخیز گیدڑ نفی کرنے لگتا۔

''وہ.....نہ.....نا.....نا.....وہ نا.....آ.....ملے.....گا.....آ.....آ.....ہو.....ہو.....ہو۔''

گیدڑوں کی خوخیاہٹیں واضح تر ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ گئی۔ قرآن پاک الماری میں رکھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

عالیہ فرش پر گدا بچھائے گال کے نیچے ہاتھ دھرے بے خبر سو رہی تھی۔

اس کا رخ باتھ روم کی طرف تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی۔ بوتل کو ایک نظر دیکھ کر وہ اونیل کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔ ہینڈل کو دھیرے سے گھما کر وہ اندر داخل ہوگئی۔ اونیل چہرے تک چادر تانے ہوئے لیٹا تھا۔ وہ گربہ پائی سے چل کر اس کے سرہانے پہنچی اور چادر اس کے چہرے سے ہٹادی۔ وہ ذرا سا کسمسایا تھا مگر اس کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔

بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے اس نے اونیل کے چہرے پر نظریں جمادی تھیں۔ وہ کس قدر مکروہ نظر آ رہا تھا۔ پیپ بھرے پھوڑوں سے پر۔ جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی۔ ہونٹوں کا گوشہ اس طرح چرا ہوا تھا کہ نچلے جبڑے کے دانت دکھائی دے رہے تھے۔ آنکھوں کے گڑھوں اور گالوں کے بے شمار چیروں میں سفید کیڑے کلبلا رہے تھے۔ ادھ کھلے منہ میں مکھیاں گھس رہی تھیں۔ کمرے میں ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سانس روکے ذرا سا پیچھے ہٹ گئی۔ اور بوتل عین اس کے چہرے کے اوپر الٹ دی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا، کسی ذبح ہوتے جانور کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ اندھی اور بہری بن کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

اونیل کی چیخوں نے عالیہ کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگتی ہوئی آئی اور اندر کا منظر دیکھ کر حلق کے بل چیختی الٹے قدموں لوٹ گئی۔ پتا نہیں وہ کسے پکار رہی تھی۔ جاشیہ آوازوں کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ نہ جانے کیسا شور برپا تھا۔ لوگ نامانوس زبان میں چلا رہے تھے۔ جیسے بہت سے گیدڑ مل کر خوخیار رہے ہوں، نہ جانے وہ نیند میں تھی یا جاگ رہی تھی۔ سب کچھ بہت عجیب سا تھا۔ اس نے بوتل میں بچے ہوئے تیزاب کو اپنے کوڑھ زدہ ہاتھوں پر گرانا شروع کیا۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری تھی۔ اس کے دماغ پر تاریکی جھپٹ رہی تھی۔ پھر اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا۔ کچھ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جا رہے تھے۔ وہ ان کو نہیں پہچانتی تھی۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

''تو ایک بار بھی میری طرف نہ دیکھے گا؟ صرف ایک نظر مجھے دیکھ۔ صرف ایک نظر.....'' وہ چلائے جا رہی تھی۔

''کیا تجھے مجھ سے گھن آتی ہے.....کیا تجھے.....''

✠ ✠ ✠

ماہ رمضان اپنے اختتام کی جانب رواں تھا۔ آخری عشرہ چل رہا تھا۔ رات بہت خنک تھی۔ ہوا کی سرد سانسیں تن سے لپٹ کر ٹھٹھرائے دیتی تھیں۔ اماں اس کمرے میں جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں۔ جس سے متصل کوٹھڑی میں بگو بند تھی۔ عائشہ لحاف اوڑھے قریب ہی چارپائی پر لیٹی تھی۔ اس کے پہلو میں کنیز اپنی چارپائی پر گہری نیند سو رہی تھی۔

اماں کی دانست میں وہ دونوں نیند میں تھیں۔ مگر عائشہ جاگ رہی تھی۔ لحاف کے اندر منہ کیے وہ جھکی آنکھوں کے ساتھ ساکت پڑی تھی۔

اماں نے سلام پھیر کر ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر بگو کو مخاطب کر کے بولیں۔

''اندر نگ ہے ناں، کہیں ٹھنڈ تو نہیں لگتی تجھے۔ نی بگو! مجھے بددعا تو نہیں دیتی تو، مجھ سے خوش رہا کر۔ کڑیاں دونوں سوگئی ہیں۔'' اماں نے سرد آہ بھری۔

''یہ راتیں کوئی سونے کے لیے ہیں۔ عبادت کرنے کی راتیں ہیں، جتنا ثواب کمایا جائے، کمالو، رب کو راضی کرنے کا اس سے چنگا ویلا اور کوئی نئیں، نبی پاک کا فرمان ہے۔ اس خاص رات کو رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کرو۔ سوہنے رب کا ناں لیتے ہوئے رات گزارنی چاہیے۔ نیندر (نیند) کس کام آوے گی۔ وہ بدنصیب ہے جو سوتا رہ جائے۔''

اماں پھر سے نوافل پڑھنے میں مشغول ہوگئی تھیں۔ وہ جاگتی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا، جب وہ بستر سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی تھی۔ اماں جائے نماز پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک بازو پہلو تلے دبا ہوا تھا اور دوسرا بازو دہلیز کی سمت پھیلا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر صحن میں نکل آئی۔ ابھی وہ ٹونٹی سے کچھ دور تھی کہ کسی عجیب سے احساس میں گھر کر تھم گئی۔ اس کی آنکھوں نے ایسا عجب منظر دیکھا جو ناقابل یقین تھا۔

سیوتی کے پودے پر پھولوں کا موسم نہیں تھا مگر پودا سفید پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس کی شاخوں پر دودھیا چاند اتر آئے تھے۔ سیوتی کا پودا کسی رینگنے والی بیل کی مانند زمین پر بچھا ہوا تھا۔ اٹی کا درخت اس حد تک جھکا ہوا تھا کہ اس کی اوپری شاخیں زمین کو چھونے لگی تھیں۔ آندھی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بلکہ ہوا بھی تھمی ہوئی تھی۔ نہر پار والے بیلے میں کچھ دیر پہلے شور مچاتے گیدڑ

اب بالکل خاموش تھے۔ اسے لگا جیسے ساری کائنات چپ ہو۔ ایک ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ آسمان پر چاند کا نشان تک نہ تھا۔ پھر اس قدر روشنی کیوں تھی، وہ ایک ایک شے کو اتنی وضاحت سے دیکھ سکتی تھی جیسے دن کے اجالے میں دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے دیواروں کو جھکتے ہوئے پایا۔ اس کے گھر کی دیواریں جھکی چلی آ رہی تھیں۔ دروازے کے ادھ کھلے کواڑوں سے جھانکتے اماں کے ہاتھ کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ چیخ کر ان کو خبردار کر دے، کمرے کا جھکاؤ دیکھ کر اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ڈھے جائے گا۔ باوجود کوشش کے وہ حلق سے آواز نہیں نکال سکی تھی۔

اسے شدید پیاس لگ رہی تھی، وہ نلکے کے قریب گئی اور ہتھے کو نچلی طرف دبایا۔ تب اسے یاد آیا تھا کہ بہت عرصے سے وہ لوگ نلکے کے پانی کا استعمال ترک کر چکے تھے۔ کیونکہ اس میں مسلسل مٹی اور ریت کے ذرات آنے لگے تھے۔ مگر وہ ہتھے پر دباؤ ڈال چکی تھی۔ اور قطعی غیر ارادی طور پر نل کے سامنے ہاتھ پھیلا چکی تھی۔ پانی اتنی آہستگی سے نکلا کہ اس کے ہاتھ آگے کرنے سے پہلے ایک بوند بھی نیچے نہیں گری۔ اس نے ایسا پانی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا، اس کی اوک میں پگھلی ہوئی چاندنی بھر گئی تھی۔

ایک گھونٹ سے اس کی پیاس بجھ گئی۔ پانی بے حد شیریں اور خوشگوار حد تک ٹھنڈا تھا۔ اس کے اندر کوئی انہونی سی خوشی سرائیت کر رہی تھی۔ اس کے دل کو بادل جیسے کسی لطیف جذبے نے چھو لیا تھا۔ وہ اتنی ہلکی تھی جیسے دھنکی ہوئی روئی کا کوئی گالا، وہ سجدے میں گر گئی۔ اس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ وہ کسی ناقابل فہم کیفیت سے گزر رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

اماں کی آنکھ کھلی تو آسمان کی سیاہی میں ہلکی سی نیلاہٹ گھل رہی تھی۔ دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔ عائشہ آنگن کے وسط میں املی کے پیڑ تلے نماز پڑھ رہی تھی۔ بہت عرصے بعد وہ اس قدر پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دھلے ہوئے چہرے پر گلابی جاڑوں کی کسی اجلی صبح جیسی کیفیت تھی۔ اماں وہیں بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ سلام پھیرنے کے بعد دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی پلکوں اور آہستگی سے ہلتے ہونٹوں سے اس اضطراب کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا جو گزشتہ کئی ماہ سے اس کے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ دعا مانگ کر اس نے جائے نماز

سمیٹی اور اماں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''اماں! تو نماز پڑھ لے، پھر مجھے تجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔''

اماں حیرت سے اس کے متبسم چہرے کو دیکھتے ہوئے اٹھیں اور وضو کرنے چلی گئیں۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ صحن میں آئیں تو عائشہ املی کی شاخوں سے معلق آب خوروں میں چڑیوں کے لیے چاول اور پانی ڈال رہی تھی۔

''کیا بات کرنی ہے عیشو.....''

''تو نے رفیق کے رشتے کے لیے میری مرضی پوچھی تھی ناں، اب اگر اس کے گھر سے پیغام آئے تو ہاں کر دینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اماں خاصی دیر تک کچھ بول نہیں سکیں۔

''تو دل سے کہہ رہی ہے؟''

''ہاں اماں!''

وہ بالکل دکھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور سکون تھا۔

''ابے سے کہنا، کسی چوڑیوں والی کو گھر بھجوا دے۔ اور واپسی پر مہندی بھی لیتا آئے۔ عید تو سر پر آ گئی ہے۔''

وہ املی کی ڈالیوں پر چہکتی گوریاؤں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

عید کے دوسرے روز دوپہر کے وقت عجی اور صدف آ گئے۔ ان کی آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ ابا کسی جاننے والے کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اماں اور کنیز بڑے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ عائشہ باورچی خانے میں گڑ والے چاول پکا رہی تھی۔

عجی نے مٹھائی کا ڈبہ چارپائی پر رکھتے ہوئے پیار لینے کے لیے اماں کے سامنے سر جھکا دیا تو اماں کا ہاتھ آگے نہ بڑھا۔ صدف کے سلام کا جواب بھی انہوں نے محض سر ہلا کر دیا تھا۔ وہ کنیز کے پاس بیٹھ کر حال احوال دریافت کرنے لگی تھی۔

عجی کچھ دیر چپ سا کھڑا رہا اور پھر باورچی خانے کا رخ کیا۔ صحن پار کرتے ہوئے باورچی خانے کے کھلے دروازے سے وہ عائشہ کی جھلک دیکھ چکا تھا۔

دروازے میں ٹھہر کر وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ خاصی دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر عائشہ نے سکوت کو توڑنے میں پہل کی تھی۔

''کیسے ہو عجی؟ گھر میں سب خیریت ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم چل کر اماں کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اب بھی خاموش تھا۔

عائشہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ چاولوں کو گڑ والے پانی میں ڈالنے لگی تھی۔

''میں کہوں کہ مجھے معاف کردے تو.....''

''میں تو تم سے ناراض ہی نہیں ہوں، معافی کس بات کی؟'' اس کے لہجے میں کوئی چبھن نہیں تھی۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں تیرے پاس۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے ایک چوکی دروازے کے قریب کھسکائی۔

''کیوں ناراض نہیں ہے تو۔ میں نے جنگلی جانوروں جیسا سلوک کیا تیرے ساتھ۔ تیرا اعتبار ہی نہیں کیا، کچھ نہ بول، مجھے کہنے دے۔''

اس کے ہونٹوں کو جنبش کرتے دیکھ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

''اندر جلتا ہے میرا، ایک گھڑی چین نہیں آتا۔ جب میں چاچی سے جھوٹی سچی بکواس کر کے واپس جا رہا تھا تو اس وقت تو پرانی کوٹھڑی میں رب سے موت کی دعا کر رہی تھی اس ویلے مجھے لگا جیسے کسی نے میرے دل پر پیر رکھ کر اسے کچل دیا ہو۔ مجھے پتا تھا تو بے گناہ ہے۔ مجھے پتا تھا تو نے کچھ نہیں کیا۔ تیرا کوئی قصور نہیں، پر میں کمینہ بن گیا تھا۔ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا۔ میں کیا کروں۔ میں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے تجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ تجھے گالیاں دیں۔ میں انسان نہیں رہا تھا کتا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑا ظلم کیا۔ مجھے معاف کردے۔''

اس نے ایک مختصر نگاہ عجی کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی اور آہستگی سے بولی۔

''میں نے معاف کیا۔ میرے دل میں کوئی شکایت نہیں۔''

''یوں نہ معاف کر۔ مجھے گالیاں دے۔ مجھے مار، مجھے دھکے دے۔ گھر سے نکال دے

اور میں بڑا ذلیل ہوں، کمینہ ہوں، مجھے معاف نہ کر۔'' اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

''میں نے ساری حیاتی کسی سے معافی نہیں مانگی۔ اپنے ابے سے بھی نہیں، تیرے سامنے ہاتھ بندھے ہیں میرے۔''

''اٹھو، اندر چل کر سب کے پاس بیٹھیں۔''

''تو ایسے کیوں کر رہی ہے۔ تیری بے پروائی مجھے بڑا دکھ دے رہی ہے۔'' عجی حیران تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر آنکھیں بھرلانے والی عائشہ اتنی مضبوط کیسے ہو گئی۔

''تم دل پہ کوئی بوجھ مت لو۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب کوئی پرانی بات نہ دہرانا۔''

''میں نے سوچا تھا۔ اس کو مار کر پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ میں زندگی سے تنگ آ گیا تھا، پر اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ وہ مجھے ملا ہی نہیں۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ پر رب کو ہی منظور نہیں تھا تو کیسے مل جاتا وہ۔ جب وہ ظالم سے بدلہ لینے پر آتا ہے تو اس طرح سے گرفت کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔''

عائشہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

وہ باہر جانے لگی تو عجی دھیرے سے بولا۔

''ابھی ٹھہر جا، تو جو سزا دے مجھے منظور ہے۔ میں جانتا ہوں معاف کرنا آسان نہیں ہے۔ میں معافی کا حقدار بھی نہیں ہوں۔ پر میں انسان ہوں عائشہ! میرا دل اتنا مضبوط نہیں کہ ایسی بات کو سہار سکے۔ اس روز مجھے لگا تھا جیسے کسی نے بھرے بازار میں گٹر کا پانی مجھ پر ڈال دیا ہو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ مجھے تجھ سے شکایت نہیں تھی۔ مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ میرا دل کرتا تھا۔ سارے جہان کو آگ لگا دوں۔ ساری دنیا پھونک ڈالوں۔ اپنے آپ کو فنا کرلوں۔ میں کھولتا رہا، میرے اندر بھانبھڑ مچتے رہے۔ میرا ہر ایک سے بدلہ لینے کو دل کرتا تھا۔ بھانویں کوئی قصوروار ہو یا بے قصور۔

اسی حال میں چاچی نے مجھے بلا لیا۔ اور اس کے سامنے بھی میں بکواس کر بیٹھا۔ واپس گھر جا کر میں رویا، عائشہ۔ میں نکے بالوں (چھوٹے بچوں) کی طرح رویا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں کبھی نہیں رویا۔ پر اس دن میں روتا رہا۔ جانتی ہے کس لیے؟ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تجھے دکھ دینا نہیں چاہتا تھا پر پھر بھی..... مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں تھا۔ میں سودائی

ہوگیا تھا۔ خدا قسم۔ میرے دل میں رتی برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ تیرا کوئی قصور ہے۔ میں شروع سے تجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔''

عائشہ نے نہایت رسان سے اس کی بات سنی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

''اللہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے ''کن'' اور وہ ہو جاتی ہے۔'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''میں اور تم اس کی مصلحت کا بھید نہیں پا سکتے۔ تمہارے آنے پر مجھے کوئی حیرت نہیں، وہ دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ تم نہ بھی آتے، ساری زندگی نہ آتے تو بھی مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔ جو ہمارے لیے بہتر ہے، وہ ہمیں دے دیتا ہے۔ اور جو نہیں دیتا، وہ ہمارے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ وہ ہم سے کوئی چیز لے تو ہم کہتے ہیں۔ اس نے چھین لی۔ ہمیں محروم کر دیا۔ یہ نہیں سوچتے کہ جو شے اسی کی دی ہوئی تھی۔ اس نے واپس لے لی تو ناراضی کیسی۔ واویلا کس بات کا۔ لوگ کہتے ہیں اس کا پیار دکھ دینے والا ہے۔ تم ہی بتاؤ جو دکھ نہ دے، رلائے نہ۔ وہ پیار ہی کیسا، جس میں ہنسی ہی ہنسی ہو، سکھ ہی سکھ ہو۔ وہ پیار تو نہ ہوا۔''

عجی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''تجھے اتنی باتیں کیسے کرنی آ گئیں عائشہ! تو تو بولتی ہی نہیں تھی۔'' وہ دیگچی کے نیچے آنچ تیز کرنے لگی تھی۔

''ایک بات کا جواب دے مجھے۔ میں امی اور ابے کو بھیجوں تو..... انکار تو نہیں کر دے گی۔''

''اپنی ماں کا دل نہ دکھاؤ۔ وہ خوش نہیں ہوں گی۔ جیسے ان کی مرضی ہو ویسے کرو۔ ماں باپ کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔''

''اس کی مرضی کے بغیر کچھ کروں گا تو گھر سے نہ نکال دے گی مجھے۔'' صدف کو اس طرف آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا۔

عائشہ کے اندر کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ وہاں سکون ہی سکون تھا۔ کسی گہری جھیل جیسا ہموار بہاؤ تھا۔ صدف اس سے باتیں کرنے لگی تو عجی اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''تمہیں میری ولیمز کے بارے میں پتا چلا؟'' اس کے باہر جاتے ہی صدف بولی۔

''میں نے دو دفعہ جو فون کیا تمہیں اس کے متعلق بتانے کے لیے کیا تھا۔ لیکن تم فون سننے آئی ہی نہیں، کتنے دنوں تک اخبار میں شہ سرخیاں لگتی رہیں۔ وہ مسلمان تھی۔ عیسائی ہو کر اونیل سے شادی کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو جلا دیا ہے۔ وہ بچ تو گیا ہے لیکن اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی ہیں۔ مقدمہ چل رہا ہے۔ میں چند اخبار ساتھ لے کر آئی ہوں۔ تم خود ہی پڑھ لینا ساری تفصیل، کیسی معصوم شکل تھی اس کی۔ تمہاری تو پکی سہیلی تھی۔''

✠ ✠ ✠

اسے لیونیٹک اسائلم (پاگل خانے) میں آئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اس کی طرف سے مقدمے کی پیروی ملک کی ایک معروف این جی او نے کی تھی اس کیس کی ملک بھر میں بڑی شہرت ہوئی تھی۔ اخبارات میں لمبے چوڑے فیچر چھپے تھے۔

کرسچن کمیونٹی کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسے سخت ترین سزا دی جائے۔ کچھ مذہبی جماعتوں نے اسے کافر قرار دے کر مذمتی بیان جاری کیے تھے۔ کئی ملکی اور غیر ملکی اخباروں کے نمائندے اس کا انٹرویو کرنے پہنچے تھے۔

بہت عرصے تک اس کا نام اخبارات کی شہ سرخیوں میں چھپتا رہا تھا۔ وہ تمام وقت مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے آنے والے لوگوں میں اپنی ماں کا چہرہ ڈھونڈتی رہی تھی۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ جس مکان میں وہ رہا کرتے تھے۔ اب وہاں نئے کرائے دار آ چکے تھے اور انہیں عفت آرا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جانے وہ مر چکی تھیں یا اس سے ملنا نہیں چاہتی تھیں۔

عدالت نے اسے ذہنی طور پر غیر متوازن قرار دیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ پاگل تھی یا ہوش مند، عقل اور جنوں کا فرق اسے نہیں معلوم تھا۔ سب کچھ خلط ملط ہو گیا تھا، جانے وہ تب پاگل تھی جب اس نے اونیل کو حاصل کرنے کے لیے ہر شے داؤ پر لگا دی تھی یا اب اس کے حواس سلامت نہیں رہے تھے۔

وہ اس پجارن کی مانند دیوتا کے سامنے رقص کرتی رہی تھی۔ جو اپنی خواہش کے اصل کو نہیں جانتی۔ جو اپنی مانگ کو پہچانے بنا ناچتی رہتی ہے۔ جو یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتی کہ اصل میں

اس کی چاہ کیا ہے۔اور اپنے پاؤں لہولہان کر لیتی ہے۔

وہ یہ بات فراموش کر بیٹھی تھی کہ پتھر سے تراشے گئے اصنام اور گوشت پوست کے انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ دیوتا جب تلک سنگھاسن پر براجمان رہیں، ساکت اور جامد ہوں، فریادوں، التجاؤں سے بے نیاز رہیں دیوتا ہوتے ہیں اور جب سانس لینے لگیں، جمود ٹوٹ جائے تو دیوتا نہیں رہتے۔انسان ہو جاتے ہیں اور انسانوں سے خوف تو آیا ہی کرتا ہے۔

اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔آواز بہت مدھم تھی۔الفاظ واضح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔اسے جس کمرے میں رکھا گیا تھا۔اس میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کے قریب گئی اور مختصر چوکھٹے میں لگی ہوئی جالی کو انگلیوں سے بجانے لگی۔

''کیا بات ہے؟'' سسٹر ندا نے اٹھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

''وہ سامنے والی کھڑکی کھول دو۔میں اذان کی آواز سننا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں شدید اضطراب تھا۔

سسٹر ندا نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا اور کھڑکی کے پٹ وا کر دیے۔اب اذان کے الفاظ وضاحت سے سنائی دینے لگے تھے۔

موذن پکار رہا تھا۔

حی علی الفلاح

حی علی الفلاح

وہ سجدے میں گر گئی تھی۔

تمت بالخیر